Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1959ء

ضرورت سے زائد مال!

حضرت ابوھریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا کہ بندہ "میرا مال ۔ میرا مال" کہتا رہا ہے حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں ۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے ۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے ۔ اور (۳) جو کچھ دوسروں (کی پرورش کے لئے) دیکر اسے اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے ۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے اور یا وہ اسے دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے ۔ (مسلم)

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گل برگ لاہور

قیمت بارہ آنے

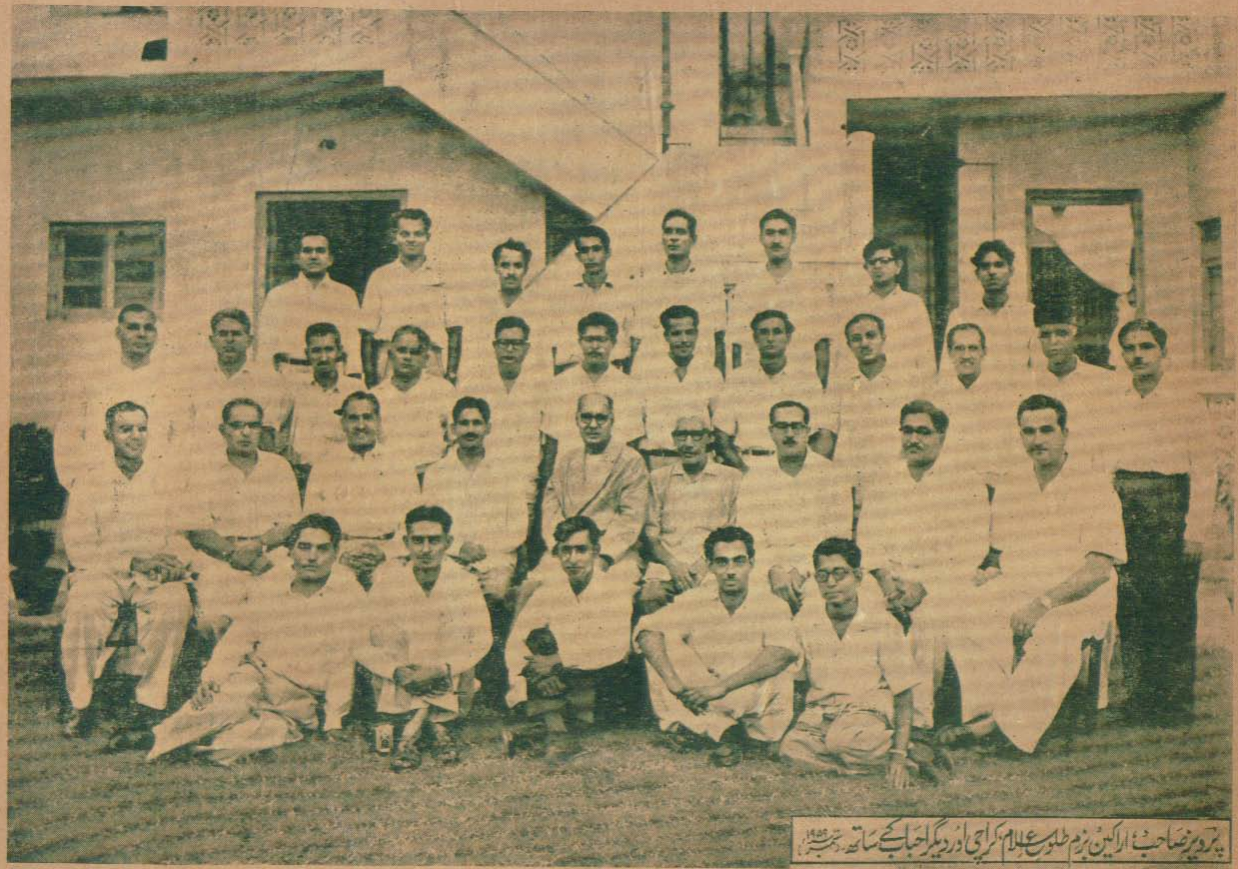

پرویز صاحب اراکین بزم طلوع اسلام کراچی اور دیگر احباب کے ساتھ ستمبر ۱۹۵۹

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے :- آٹھ روپے
غیر ممالک سے :- ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون :- ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ : ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵-بی ـــــ گلبرگ لاہور

جلد ۱۲ | اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء | نمبر ۱۰

فہرست مضامین

لمعات		۲ ـــ ۹
پرویز صاحب کا کراچی کا دورہ	(ابوالعاکف)	۱۱ ـــ ۳۱
قرآنِ کریم کا معاشی نظام	(محترم پرویز صاحب)	۳۳ ـــ ۴۸
انسان اور خارجی کائنات	(محترم پرویز صاحب)	۴۹ ـــ ۵۶
مجلسِ اقبال		۵۷ ـــ ۶۹
اسلامی نظام کے بنیادی تصورات	(محترم پرویز صاحب)	۷۱ ـــ ۷۴
حقائق و عبر	(تفسیرِ قرآن کے اختلافات)	۷۵ ـــ ۷۶
رابطۂ باہمی		۷۸ ـــ ۸۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے "اسلامک آئیڈیالوجی" کے عنوان سے (سلیم کے نام خط کی شکل میں) جو مبسوط مقالہ شائع کیا اور لمعات میں "آزادی" کے موضوع پر جو شذرات سپردِ قلم کئے، اس سلسلہ میں قارئین کی طرف سے بہت سے نکات کی مزید وضاحت چاہی گئی ہے۔ اور بعض دیگر امور سے متعلق استفسارات کئے گئے ہیں، اشاعتِ حاضرہ کے لمعات کو انہی کے لئے وقف کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان امور کا تعلق پاکستان کے آئندہ دستور سے ہے اس لئے یہ جس غور و فکر کے محتاج ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ بے مثل و بے نظیر کتاب ہے اور اس کا چیلنج ہے کہ ساری دنیا مل کر بھی اس کتاب کی مثل مرتب نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم کن معنوں میں بے مثل و بے نظیر ہے، اس سوال کے متعلق ہمارے ہاں بڑی طول طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ لیکن اگر ذرا بنگاہِ تعمق دیکھا جائے تو اس سوال کے جواب کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں لاحق ہوتی۔ قرآن کریم نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ حیات ہے اور اس کے بے مثل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کا کوئی اور ضابطہ حیات اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کسی ضابطۂ حیات کے بروئے کار آنے کے لئے "نظام" کی ضرورت ہوتی ہے اور (یہ ظاہر ہے کہ) کوئی نظام مملکت (STATE) کے بغیر عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ بالفاظ دیگر، مملکت ضابطہ حیات کو محسوس پیکر عطا کرتی اور اس کے لئے ایسی فضا مہیا کرتی ہے جس میں وہ اپنے نتائج زندہ اور مشہود پیکر میں مرتب کرے۔ اسی کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں "مملکت کا کانسٹی ٹیوشن (دستور) کہتے ہیں اسلامی مملکت اسے کہتے ہیں جو قرآن کے ضابطۂ حیات کو اپنے کانسٹی ٹیوشن کی بنیاد قرار دے۔ مملکت پاکستان، اسلامی مملکت بننے کی آرزومند اور مدعی ہے۔ یہ دعویٰ اس وقت شرمندۂ معنی ہوگا جب اس ملک کا دستور، قرآنی ضابطۂ حیات کی بنیادوں پر مرتب ہوگا۔ ہماری تاریخ میں، اس سے پہلے، اس قسم کا کوئی کانسٹی ٹیوشن مرتب نہیں ہوا۔ عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ (رضی) میں، ہمارے معاشرہ کی عمارت قرآنی خطوط پر استوار ہوئی تھی لیکن اس وقت کوئی تحریری دستور (WRITTEN CONSTITUTION)

مرتب نہیں ہوا تھا — اس زمانے میں ابھی اس کا رواج ہی نہیں تھا — اس کے بعد مملکت کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور اسلامی مملکت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ ملوکیت میں کسی آئین و دستور کی ترتیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں بادشاہ کا حکم آئین اور اس کا فیصلہ قانون ہوتا ہے۔ لہٰذا ہماری تاریخ میں قرنِ اول کے بعد ہر جگہ اور ہر زمانے میں مسلمانوں کی حکومتیں تو رہی ہیں اسلامی مملکت کہیں بھی قائم نہیں ہوئی۔ موجودہ زمانے میں، بعض مسلم ممالک میں ملوکیت کی جگہ (مغربی انداز کی جمہوری) حکومتیں بھی قائم ہوئی ہیں لیکن چونکہ انھوں نے بھی اپنی مملکت کی بنیاد قرآن پر نہیں رکھی اس لئے نہ انھیں اسلامی مملکت کہا جا سکتا ہے نہ ان کے آئین کو اسلامی آئین۔ ہماری ساری تاریخ میں (قرنِ اول کے بعد) پاکستان پہلی مملکت تھی جس نے اسلامی مملکت بننے کا دعویٰ کیا۔ لیکن ہماری سابقہ مجلسِ دستور ساز نے جس قسم کا آئین مرتب کیا اُسے اسلامی دستور سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ الحمد للہ کہ وہ دستور کالعدم قرار پا گیا۔ اب، از سرِ نو دستور کی تدوین کا سوال زیرِ غور ہے۔ یعنی پھر مملکتِ پاکستان کی فکر و بصیرت کا امتحان ہے کہ وہ ایسا آئین مرتب کرتی ہے یا نہیں جسے صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے (ہم نے صرف "فکر و بصیرت" کا امتحان کہا ہے نیت اور ارادے کا امتحان نہیں کہا۔ اس لئے کہ ہمارے اندازے کے مطابق، مملکت کے موجودہ سربراہوں کی نیت اور ارادہ نیک نظر آتا ہے۔ لہٰذا ان کے ضمن میں سوال صحیح قرآنی بصیرت کا ہے۔ اگر انھیں وہ میسر آ گئی تو آئین اسلامی بن جائے گا — خدا کرے کہ ایسا ہی ہو)۔

(۳) ہم نے اوپر کہا ہے کہ اسلامی مملکت کا آئین جو قرآنی ضابطۂ حیات پر مبنی ہو گا بے مثل و بے نظیر ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دستور دنیا کی دیگر مملکتوں کے آئین و دساتیر سے منفرد و ممتاز ہو گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس دستور کے بعض اجزاء دیگر دساتیر کے اجزاء سے ملتے جلتے ہوں — اس لئے کہ نزولِ قرآن کے بعد عقلِ انسانی نے اپنے پیہم تجارب سے، نیز قرآنی تعلیم سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہو کر، قرآن کے کئی ایک اصولوں کو اپنا لیا ہے۔ لیکن من حیث الکل یہ دستور منفرد اور بے مثل ہو گا۔ "من حیث الکل" اس لئے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کو ایسے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کرنے کے بجائے جنھیں ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہ ہو، انسان کو تماماً (AS A WHOLE) لیتا ہے اور جو ضابطۂ حیات اس کے لئے تجویز کرتا ہے اسے بھی ایک غیر منقسم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) قرار دیتا ہے۔

(۴) اسلامی آئین کی رُو سے مملکت کا نظام خدائی قوانین پر متفرع ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس کا فریضہ قوانینِ خداوندی کو (جو قرآن میں محفوظ ہیں) عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ نظام تھیاکریٹک (THEOCRATIC) نہیں ہوتا۔ تھیاکریسی سے مفہوم یہ ہے کہ مذہبی پیشواؤں (یا بعض صورتوں میں ان کی منظوری سے خود بادشاہ) کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنے فیصلوں کو خدا کے نام پر منواتے ہیں۔ یہ استبداد کی بدترین شکل ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اسلامی نظام میں مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ نہ کسی کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں فقہا اور مجتہدین کا بھی الگ طبقہ نہیں ہوتا۔ ملک کے اربابِ علم و بصیرت مختلف مسائل پر غور و فکر ضرور کرتے ہیں لیکن وہ اپنے فکر کا ماحصل کو مملکت کے سپرد کر دیتے

ہیں۔ مملکت، افراد ملت کے اس علمی متاع سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ لیکن قانون کی حیثیت وہی فیصلے اختیار کرتے ہیں جنھیں مملکت قانون کی حیثیت سے نافذ کرے۔

(۵) اسلامی نظام کی رو سے، مختلف معاملات امت کے باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں لیکن یہ انداز مغرب کے جمہوری انداز سے مختلف ہوتا ہے۔ مغرب کی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) عوام کو حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اسے اس امر کا کامل اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا چاہے قانون بنائے اور جس قانون کو چاہے منسوخ کر دے۔ اس کے فیصلے نہ کسی شرط سے مشروط ہوتے ہیں۔ نہ کسی حد سے محدود۔ اس کے برعکس، اسلامی نظام میں، نمائندگان ملت، قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے فیصلے کر سکتے اور قوانین وضع کر سکتے ہیں۔ ان کی اکیاون آراء تو ایک طرف، سو فیصدی آراء بھی قرآنی اصولوں میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتیں، چہ جائیکہ انھیں منسوخ کر دیں۔ مملکت کے یہ فیصلے، جو قرآنی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے کئے جائینگے (مروجہ اصطلاح کے مطابق) "قوانین شریعت" قرار پائیں گے۔ ان قوانین میں، زمانے کے تقاضوں کے مطابق ردوبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن قرآن کے اصول اپنی جگہ پر اٹل رہیں گے۔ مملکت کا سربراہ (HEAD OF THE STATE) بھی لازمی طور پر نمائندگان امت کی اکثریت کے مشورہ کا پابند ہوگا۔ اگر وہ دیکھے کہ اکثریت کا مشورہ قرآن کے کسی اصول سے ٹکراتا ہے تو اسے یہ حق حاصل ہوگا کہ اسے مسترد کر دے یا اس میں مناسب ردوبدل کر دے۔

آپ نے دیکھا کہ اسلامی نظام میں جمہوریت کا قالب (PATTERN) بھی منفرد انداز کا ہوگا۔

(۶) چونکہ اسلامی نظام، اپنے اصولوں کے اعتبار سے، یکسر منفرد اور بے مثل و بے نظیر ہے، اس لئے اس میں نہ کسی اور نظام سے مصالحت (COMPROMISE) کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ مختلف نظاموں کے امتزاج سے ایک نئے نظام کی تخلیق کا تصور۔ اس قسم کی مصالحت یا اشتراک کو قرآن شرک سے تعبیر کرتا ہے جو عدالت خداوندی میں ناقابل معافی جرم ہے۔ وہ اس کی تو اجازت دیتا ہے کہ کوئی قوم، اسلامی نظام سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی دوسرا نظام تجویز کرے (اسے وہ کفر سے تعبیر کرتا ہے) لیکن اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک قوم اسلامی نظام کے حامل ہونے کا دعویٰ کرے اور اپنے ہاں خالص قرآنی نظام کی جگہ، ایسا نظام رائج کرے جس میں بعض اجزا قرآنی ہوں اور بعض غیر قرآنی۔ یا جس میں کسی قرآنی اصول میں لچک پیدا کر کے کسی غیر قرآنی نظام سے مصالحت کی شکل پیدا کر لی جائے۔

(۷) اسلامی نظام اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوع انسانی کے لئے ماڈل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، وہاں سے اسلامی نظام کی آخری منزل تک پہونچنے میں وقت درکار ہوگا۔ اس قسم کا انقلاب شباشب نہیں لایا جا سکتا۔ اسلامی دستور، اس آخری منزل کا تعین بصراحت کر دے گا اور اس امر کی وضاحت بھی کہ اس منزل تک کس طرح پہنچا جائے گا۔ اس عبوری دور میں اس امر کی خاص احتیاط رکھی جائے گی کہ ہمارا کوئی قدم ایسی سمت نہ اٹھنے پائے جو ہمیں ہماری منزل مقصود کی طرف نہ لے جا رہی ہو۔

(۸) قرآن کریم کی رُو سے منزل (ENDS) اور اس تک پہنچنے کے ذرائع (MEANS) میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تصور یکسر خلاف قرآن ہے کہ بلند مقصد کے حصول کے لئے ناجائز ذرائع بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جس طرح غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا" اسی طرح ناجائز ذرائع کبھی جائز مقصد کے حصول کے لئے اختیار نہیں کئے جا سکتے۔ اس راستے پر ہر قدم حق و صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں۔ وہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے، خود حق و صداقت کے راستہ پر چلنا اور دوسروں کو اس راستے پر چلانا۔ (حق و صداقت کے راستے سے مراد وہ صراطِ مستقیم ہے جسے قرآن کریم نے متعین کیا ہے) اگر ہم حق و صداقت کو چھوڑ کر مملکت حاصل کرتے یا اسے مستحکم بناتے ہیں تو یہ ہماری کامیابی نہیں، شکست ہے۔ اس لئے اسلامی نظام کے قیام اور استحکام کے لئے کوشش کرنے والوں کو اس بات کا خیال تک بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے کہ اس کے لئے کوئی ناجائز ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

(۹) قرآن کی رُو سے تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس میں تفریق کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ قرآن کو ضابطۂ حیات تسلیم کریں وہ ایک قوم کے افراد اور جو اس سے انکار کریں وہ دوسری قوم کے افراد۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو جماعتِ مومنین کے افراد، (یعنی وہ لوگ جو قرآنی ضابطۂ حیات کو اپنا نصب العین قرار دیں) مسلم قوم کے فرد ہوں گے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی کیوں نہ بستے ہوں۔ قرآن کا منتہیٰ یہ ہے کہ نسلی یا جغرافیائی حدود سے بلند ہو کر، تمام دنیا میں ایک ہی نظام رائج کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس منتہیٰ تک پہنچنے میں وقت لگے گا۔ آج (جبکہ حالت یہ ہے کہ قرآنی نظام دنیا کے کسی ملک میں بھی رائج نہیں) اس نظام کی ابتدا بہرحال ایک خطۂ زمین ہی سے کی جائے گی۔ واضح تر الفاظ میں یوں کہیئے کہ اگر ہم نے پاکستان کو اس نظام کی تجربہ گاہ بنایا (اور امید ہے کہ ایسا ضرور ہوگا) تو پاکستان بہرحال ایک جداگانہ مملکت کی حیثیت رکھے گا۔ یعنی ہمارا یہ تجربہ پاکستان کی حدود کے اندر (TERRITORIAL) ہوگا۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اس خطۂ زمین کو ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رکھا جائے، اس لئے کہ اگر معمل (LABORATORY) ہی محفوظ نہیں رہے گی تو تجربہ کس طرح ہوگا؟ اس کے لئے قرآن کریم نے سخت تاکید کی ہے جہاں کہا ہے کہ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ...... (۸/۶۰)۔ اور تم اپنے مخالفین کے مقابلہ کے لئے جس قدر تم سے بن پڑے تیاری رکھو۔ ہر قسم کی قوت (FORCES) سے اور سرحدوں پر چھاؤنیاں بنا کر۔ تم اس سے اپنے اور اللہ کے دشمن کو خوفزدہ رکھ سکو گے (ان دشمنوں کو بھی جو تمہارے پیشِ نظر ہیں اور) ان کے علاوہ اوروں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے۔ انہیں اللہ جانتا ہے۔ .... سرحدوں کو مضبوط رکھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس خطۂ زمین کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھا جائے جو نظامِ خداوندی کی تجربہ گاہ بن رہا ہے اس خطۂ زمین کو اس طرح محفوظ رکھنا اور مستحکم بنانا، اس ملک میں بسنے والے تمام افراد کا فریضۂ اولین ہوگا۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو حب الوطنی (PATRIOTISM) اسلامی نظام کی بنیادی ضرورت اور جماعت مومنین کا اولین فریضہ قرار پاجاتی

ہے لیکن "حب الوطنی" کا وہ مغربی تصور نہیں جس کے متعلق اٹلی کے مدبر (COVOUR) نے کہا تھا کہ

جو کچھ ہم اپنے وطن کے لئے کرتے ہیں، اگر وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں، تو کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، جن امور کو قرآن ناجائز قرار دیتا ہے انھیں کسی مقصد کے حصول کے لئے بھی اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے قرآنی نظام کی رُو سے "حب الوطنی" حق و صداقت کے اصولوں کی قیمت سے نہیں خریدی جائے گی وہ ان اصولوں کی پاسبان ہوگی

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اس وقت قرآنی نظام دنیا کی کسی مملکت میں بھی رائج نہیں۔ اس لئے اس وقت دنیا میں "مسلمانوں کی مملکتیں" تو ہیں، اسلامی مملکت کہیں نہیں۔ اگر پاکستان نے قرآنی نظام اختیار کر لیا تو (ظاہر ہے کہ) اس میں اور "مسلمانوں کی مملکتوں" میں فرق ہو جائے گا۔ ان مملکتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات باہمی معاہدات (TREATIES) کی رُو سے طے پائینگے البتہ جب کوئی اور "مسلمانوں کی مملکت" بھی اپنے ہاں قرآنی نظام رائج کرے گی تو اس کے ساتھ ہمارے تعلقات اور نوعیت کے ہوں گے۔ وہ اور ہم ایک ہی راستہ کے راہرو اور ایک ہی منزل کے مسافر ہوں گے۔ اور جب تمام "مسلم ممالک" اپنے ہاں قرآنی نظام رائج کر لیں گے تو اُس وقت نقشہ ہی کچھ اور ہوگا۔ واضح رہے کہ جس طرح ایک اسلامی مملکت کو، انتظامی سہولتوں کی خاطر، مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر انتظامی سہولتوں کی خاطر ضروری سمجھا جائے متعدد اسلامی مملکتوں کی جداگانہ حیثیتوں کو بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے (لیکن یہ باتیں قبل از وقت ہیں۔ ان امور کو اُس وقت باہمی مشاورت سے طے کیا جا سکتا ہے۔ جب مختلف مملکتوں کا نصب العین حیات اور مقصود زندگی ایک ہو جائے۔ جب ضابطہ حیات ایک ہو تو پھر جزئی انتظامی امور کا حل کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

(۱۰) اسلامی مملکت میں رہنے والے تمام مسلمانوں کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ مملکت کے اختیار کردہ قرآنی نظام اور اس کے نافذ کردہ قوانین کی اطاعت کریں۔ اگر کوئی ایسا نہ کرنا چاہے تو اس کے لئے دو ہی راستے کھلے ہوں گے (۱) یا تو وہ اسلامی مملکت کو چھوڑ کر کسی اور جگہ چلا جائے اور یا (۲) اسلام چھوڑ کر مملکت میں غیر مسلم کی حیثیت سے رہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اسلامی مملکت میں مسلمان کی حیثیت سے رہیں اور مملکت کے نظام اور قوانین سے سرکشی برتیں۔ یہ مملکت کے خلاف بغاوت ہوگی جس کی قرآن کی رو سے سخت ترین سزا ہے۔

باقی رہے اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم سو انھیں وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہوں گے جو قرآن، ہر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے عطا کرتا ہے۔ اس بارے میں بعض غیر مسلموں کے دل میں جو شکوک و خطرات پیدا ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں معلوم نہیں کہ قرآن انھیں کس قدر حقوق و مراعات عطا کرتا ہے۔ اسلامی دستور میں ان حقوق و مراعات کی وضاحت ہوگی جنھیں دیکھ کر یہ (غیر مسلم) خود فیصلہ کر سکیں گے کہ اسلامی مملکت میں ان کی زندگی کس قدر امن اور خوش حالی کی زندگی ہوگی۔

اس ضمن میں البتہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جس مملکت کی بنیاد ایک واضح اور متعین آئیڈیالوجی پر ہو، اس

کے چلانے کے ذمہ دار لامحالہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اُس آئیڈیالوجی پر ایمان رکھیں جو اس آئیڈیالوجی میں (BELIEVE) نہ کریں۔ وہ رموزِ مملکت میں شرکت نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے اثبات کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی یہ "مذہبی تنگ نظری" ہے۔ یہ دنیائے سیاست کی معقول پسندانہ روش ہے (مثلاً) کوئی مملکت جس کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام (CAPITALISTIC SYSTEM) پر ہو، کسی کمیونسٹ کو شریکِ حکم نہیں کر سکتی۔ کوئی سیکولر حکومت اپنا انتظام و نسق ایسے گروہ کے سپرد نہیں کر سکتی جو سیکولرازم کو مردود قرار دے اور تھیاکریسی پر ایمان رکھے۔ کوئی دہریہ حکومت (ATHEIST GOUT) کسی خدا پرست کو مملکت کا سربراہ نہیں بنا سکتی۔ انگلستان دنیا کا سب سے زیادہ روشن خیال ملک خیال کیا جاتا ہے اور وہاں کا نظامِ حکومت بھی سیکولر ہے لیکن وہاں کوئی غیر مسلم تو ایک طرف، ایسا عیسائی بھی سربراہِ سلطنت نہیں ہو سکتا۔ جو پروٹسٹنٹ نہ ہو بلکہ جو چرچ آف انگلینڈ سے وابستہ پروٹسٹنٹ نہ ہو۔ اسلام میں مملکت مقصود بالذات نہیں۔ وہ اس الدین (نظامِ زندگی) کی عملی تنفیذ کا ذریعہ ہے جو خدا نے مقرر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس الدین میں (BELIEVE) نہیں کرتا وہ اس مملکت کا جزو کس طرح سے بن سکتا ہے؟ نیز جس مملکت میں وہی قانون جائز قرار پا سکتا ہو جو الدین کے غیر متبدل اصولوں سے ٹکرائے اس مملکت کی مجلسِ قانون ساز کا ممبر ایسا شخص کس طرح ہو سکتا ہے؟ جو ان اصولوں ہی کو صحیح تسلیم نہ کرے؟ اسلامی دستور میں اس امر کی بھی وضاحت ہونی چاہیئے تاکہ حدودِ مملکت میں بسنے والے غیر مسلم اس کی روشنی میں اپنے متعلق خود فیصلہ کر لیں۔ اس دستور میں اس امر کی بھی صراحت ہونی چاہیئے کہ حدودِ مملکت میں انھیں مذہبی عبادات و رسوم کی آزادی ہو گی۔ لیکن ملک کے عام قوانین کا ان پر بھی یکساں طور پر اطلاق ہو گا۔

(۱۱) جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اسلامی دستور کی حیثیت یکسر منفرد ہو گی۔ اس لئے اس دستور کے متعلق اس خیال سے نہیں گھبرانا چاہیئے کہ لوگ کہیں گے کہ انھوں نے دنیا جہان سے نرالا دستور بنا ڈالا۔ اگر ہمارا دستور خالص قرآنی بنیادوں پر مرتب ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ یہ دستور ان قوموں کو بھی کس طرح پیچھے چھوڑ جاتا ہے جو آج عقل و دانش اور تہذیب و تمدن میں سب سے آگے نظر آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے سامنے آج تک قرآنی نظام آیا ہی نہیں۔ ہم جب بھی اسلام کا نام سنتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے اُس مذہب کا نقشہ کھنچ جاتا ہے جس کا علمبردار ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ہے۔ یہ مذہب (جو اس طبقہ کا خود ساختہ ہے) فی الواقعہ ایسا ہے جس کے تصور سے انسان گھبرا اٹھے اور جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے شرم آجائے۔ لیکن خدا کا متعین کردہ الدین ایسا ہے کہ جو قوم اسے اختیار کرے اقوامِ عالم کی امامت (LEADER-SHIP) اس کے حصے میں آجائے اس نظام کو سامنے آنے دیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح اقوامِ عالم اس کی طرف لپک کر آتی ہیں۔

(۱۲) لیکن اس کے ساتھ اس خطرہ کو بھی سامنے رکھیئے کہ اگر ہم نے کچھ تصورات قرآنی لئے اور کچھ غیر قرآنی، اور ان کے اختلاط سے ایک آئین بنا کر اسے اسلامی دستور قرار دے دیا تو عدالتِ خداوندی میں ہم بدترین مجرم قرار پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا آئین کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کفر بھی اپنے نتائج رکھتا ہے، خواہ وہ وقتی ہی کیوں نہ ہوں، اور اسلام بھی۔ لیکن کفر اور اسلام کو

بلاکر جو مشرکانہ روش اختیار کی جائے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ــــ ایسی صورت میں جب یہ آئین ناکام ثابت ہوگا تو دنیا خود اسلام کے متعلق خیال کرے گی کہ یہ ایک "چلا ہوا کارتوس" ہے۔ کسی زمانے میں اس نے کامیاب نتائج مرتب کئے تھے لیکن موجودہ دور میں یہ ناقابلِ عمل ہے۔ یعنی ہماری اس حماقت یا منافقت سے دنیا کی نظروں میں خود اسلام بدنام ہو جائے گا۔ لہٰذا اس باب میں ہمیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے ــــ احتیاط صرف اس امر کی کہ ہم اپنے دستور کی بنیاد صرف قرآنی تصورات کو قرار دیں اور غیر از قرآن کسی تصور کو اس میں بار نہ پانے دیں۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

اگر ہم نے ایسا کر دیا تو ہم صرف پاکستان کو نہیں، مسلمانانِ عالم کو نہیں، پورے کے پورے کاروانِ انسانیت کو اس شاہراہ پر لے کر چل نکلیں گے جو اُسے اُس فردوسِ گم گشتہ تک پہنچا دے گی جس کی تلاش میں ابنِ آدم یوں مارا مارا پھر رہا ہے اور جس کا اسے کہیں سے سراغ نہیں ملتا۔ سوچئے کہ اس سے تاریخ انسانیت میں ہمارا مقام کیا ہوگا؟

کتنی بڑی خوش بختی ہو اگر یہ مقام مملکت پاکستان کے موجودہ سربراہوں کے حصے میں آجائے!

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است!!

---

(۲)

سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ

(مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ)

پاکستان کی سابقہ حکومتیں سستی شہرت (CHEAP POPULARITY) حاصل کرنے کے لئے جو تدابیر وقتاً فوقتاً اختیار کرتی رہیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ بعض اداروں کو خزانۂ عامرہ سے مستقل مالی امداد دی جاتی تھی تاکہ وہ "اسلامیات" کے متعلق تحقیقات کا فریضہ سرانجام دیں۔ اسلام کے نام پر یہ امداد جس بری طرح ضائع ہوتی رہی، وہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ان اداروں نے غریب قوم کے اس قدر گراں بہا سرمایہ سے جو "تحقیقاتی" کام کیا وہ ان کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر سے ظاہر ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ موجودہ حکومت کے سربراہوں نے اس طرف بھی توجہ دی اور ایک مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے قیام کا اعلان کر کے قوم کے دل میں نئی توقعات کی شمعیں روشن کر دیں۔ سابقہ ادارے، جنہیں حکومت سے امداد ملتی تھی، اس مرکزی ادارہ سے پیوست کر دیئے گئے ہیں۔ اب تحقیقات کا تمام کام مرکزی ادارہ کی زیرِ نگرانی اور زیرِ راہ نمائی سرانجام پائے گا۔ یہ ایک حسین اور خوشگوار تحفہ ہے جو صدر مملکت کی طرف سے عید میلاد النبیؐ کی مقدس تقریب پر اہل پاکستان کو پیش کیا گیا۔ خدا کرے کہ ان کا یہ جدید اقدام متوقع نتائج کا حامل ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس مرکزی ادارہ کے سامنے علم و ہنر کے مختلف شعبے ہوں گے جن کے متعلق تحقیق کی جائے گی

لیکن اس تمام پروگرام میں جس شے کو مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے جب تک اسے سرفہرست نہیں رکھا جائے گا ہماری کوششیں اور کاوشیں کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہیں کر سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں یہ مرکزی اور بنیادی حیثیت کتاب اللہ (قرآن کریم) کو حاصل ہے۔ ہماری زندگی کے تمام شعبے اسی سرچشمۂ ہدایت سے نکلتے ہیں اور ہماری سعی و عمل کے تمام گوشے اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ یہی ہماری ہر تگ و تاز کا منتہیٰ اور ہماری دانش و بینش کا مقصود ہے یہی ہمارے دین کی بنیاد اور ہماری دنیا کی اساس ہے۔ اسی سے ہماری اس دنیا کی زندگی تابناک اور اسی سے ہماری حیاتِ اُخروی درخشاں ہے۔ یہی ہمارے لئے حق و باطل کا معیار اور غلط اور صحیح کی میزان ہے۔ تاریخ ہو یا فلسفہ، تہذیب ہو یا تمدن، معاشرت ہو یا معیشت، قانون ہو یا سیاست۔ جو اس کسوٹی پر پورا اترے وہ کھرا، جو اس کے خلاف جائے وہ کھوٹا۔ لہٰذا ہمارے تحقیقاتی ادارے کے لئے کرنے کا کام یہ ہو گا کہ اسلاف کا جس قدر علمی سرمایہ ہم تک پہنچا ہے، اسے اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے اور اس طرح کھرے کو کھوٹے سے الگ کر کے کھرے کو باقی رکھے فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً (۱۳/۱۷) اور کھوٹے کو رائگاں جانے دے۔ اگر ہم نے یہ عظیم الشان کام کر دیا (جو آج تک نہیں ہوا) تو ہم ایسی خدمت انجام دے جائیں گے جس پر خدا اور اس کے فرشتے ہم پر تبریک و تہنیت کے پھول برسائیں گے (هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ ۳۳/۴۳) لیکن اگر ہم نے اپنی تحقیق میں اس "اصول" کو اپنے لئے قندیلِ راہ قرار دیا کہ — اگر خواہی سلامت بر کنار است — تو ہمارا شمار بھی انہی میں ہو جائے گا جن کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ ان کی تمام کوششیں ناکام رہتی ہیں وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۴) لیکن وہ اپنے آپ کو اسی فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔

اس ادارہ کے ذمہ دوسرا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ (تحقیقات کے بعد) بتلائے کہ اس وقت انسانیت جن مشکلات میں پھنسی ہوئی ہے اور اقوام عالم کے سامنے زندگی کے جو اہم مسائل ہیں، قرآن کریم ان کا کیا حل بتاتا ہے؟ یاد رکھیئے! اقوام عالم کی امامت نہ امریکہ کے حصے میں آسکتی ہے اور نہ روس کے۔ یہ صرف اس قوم کے حصے میں آئے گی جو ان مصائب کا علاج بتا سکے جنہوں نے اس وقت ساری دنیا کو طلسمِ پیچ و تاب بنا رکھا ہے اور جس کی وجہ سے آج ہر طرف سے یہ آواز سنائی دے رہی ہے کہ — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی — ہمارا دعویٰ (اور ایمان) ہے کہ قرآن کریم ہمیں اس قسم کی راہ نمائی دیتا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآن کی راہ نمائی کو دنیا کے سامنے پیش کر کے قرآن کی حقانیت اور اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت پیش کریں۔ ہماری تحقیقات اسی مقصد کے لئے ہونی چاہئیں اور یہی ہمارے اس جدید مرکزی ادارہ کا فریضہ قرار پانا چاہیئے۔

بہرحال، محترم صدر مملکت کا یہ اقدام بڑا خوش آئند ہے لیکن اس کی کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس ادارہ کو صحیح فکری راہ نمائی میسر آجائے!

جشنِ عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب

پر

اِدارہ طلوعِ اِسلام کا

گراں بہا تحفہ

مِعراجِ انسانیت

(سیرتِ نبی اکرمؐ قرآن کریم کے آئینے میں)

بتیس روپے ۳۲

کی بجائے

پندرہ روپے ۱۵

پرویز صاحب کا کراچی کا دورہ

مشاہدات و تاثرات

ابو عاکف۔ کراچی

آج سے بارہ سال پہلے اگست کے مہینے ہی میں، ملت اسلامیہ کا کاروان تقریباً سو سال تک وادیٔ ظلمات میں بھٹکنے کے بعد چشمۂ آب حیات تک پہنچا تھا اور اس سال بہت دنوں کے بعد تمنا پھر دل میں چٹکیاں لے کر بہت سی بھولی بسری یادوں کو جگا رہی تھی کہ ایک صبح مجھے میاں عبدالخالق نے ٹیلی فون کیا۔ "کشفی صاحب! پرویز صاحب آ رہے ہیں"۔ میں نے انھیں بات بھی پوری کرنے نہیں دی۔ "سچ سچ؟"۔ کب؟ آپ کو کیسے معلوم؟" اور پھر میں شرمندہ ہو کر چپ ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ یہ کیا حماقت ہے۔ میاں صاحب تو بزم طلوع اسلام کراچی کے ترجمان ہیں۔ اُن سے یہ پوچھنا کہ آپ کو کیسے معلوم کیسی عجیب سی بات ہے۔ میاں صاحب کے سفید بال بڑے خوبصورت ہیں اُن کے چہرے سے میل نہیں کھاتے۔ اور انھوں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ وہ میری ذہنی کیفیت کو سمجھ گئے۔ یہ باہمی تفہیم بھی کیا چیز ہے۔ آدمی آواز کی لہروں میں دوسرے کی صورت ہی نہیں ذہن بھی دیکھ لیتا ہے۔

قدرے وقفہ کے بعد میاں صاحب نے کہا "دیکھو جی! آج شام پرویز صاحب کی آمد اور اجتماعات کے بارے میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ شام کو بیچ لگژری آجانا۔ پانچ بجے۔ بھولنا نہیں"۔ "جی نہیں بھولنے کا کیا سوال ضرور آجاؤں گا"۔ بات ذرا سی تھی مگر خیالوں کی وسیع وادی میں لے گئی۔ کتنے ہی منظر نگاہوں کے سامنے سے جلوس بنا کر گزرتے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں طلوع اسلام کا اجرا۔ نوجوان پرویز، صبح شام علامہ اقبالؒ کے مضمون کا انتظار کر رہا تھا لیکن حکیم مشرق نے مضمون کے بدلے موت کی خبر بھیجی۔ یہ تھا دوست کا پیغام۔ طلوع اسلام کے پہلے ہی شمارے کا ماتمی سرورق، حوصلوں کو پست کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن اس روح میں تو ایک پیغام کا سودا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب تاریخ شاطرانہ انداز میں چالیں چل رہی تھی۔ اور ہوش سالوں کی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

ستاروں میں کب پہلے یہ گردش و تابش تھی
تھے موڑ پہ صدیوں کے دن ایک مہینے کے

دس کروڑ انسان نما بھیڑوں کے عظیم گلّے کو ایک مردِ راہ داں قوم بنانے کا عزم کرچکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب —— "مولانا وقفِ دَیر تھے علامہ ہیں غیر" اور اسلام کے نام پر اُس مردِ عظیم (جسے ہم جناح کہتے ہیں) کی راہ کھوٹی کی جارہی تھی۔ اُس وقت طلوعِ اسلام کی آواز گونجی کہ ہم مستقل اقدارِ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں اقدار نے ہمیں ایک قوم بنادیا ہے بنسل و رنگ اور جغرافیائی حد بندیوں سے بلند تر —— طلوعِ اسلام نے ہمیں حصارِ دین میں داخل کیا۔ پرویز کی آواز نے کتنے ہی ذہنوں کو یہ سکون بخشا کہ یہ آواز اسلامی ہے اور پھر پاکستان کی تحریک کے لئے طلوعِ اسلام اساسِ فکر بن گیا۔

منظر بدل گیا — پاکستان بن گیا۔ پرویز صاحب نئی حکومت کے اُن افسران میں سے تھے جو اس کی زندگی کے پہلے ہی دن سے اس کی نقش گری میں مصروف تھے۔ دفتر میں سر کھپاتے ہوئے وہ یہی سوچتے کہ یہ بھی تو خدمت ہے اور پھر اس وقت جب صبح کے ستارے جھلملاتے ہیں اور صبح رات سے گلے ملتی ہے وہ اپنی میز پر بیٹھ کر طلوعِ اسلام کے لئے مضمون لکھتے رہتے۔ اور جاڑوں کی طویل راتوں میں آیاتِ کلامِ ربانی اُن کے لئے آہ و فغانِ نیم شب بنی رہیں۔

منظر پھر بدل گیا: کچھ لوگ منزل پر پہونچ کر سو گئے۔ کچھ نعروں میں گم ہو گئے —— "اسلامی دستور" اور "اسلامی ریاست" اور "اسلامی نظریۂ تعلیم" —— نعرے، بڑے نعرے —— کوئی بھی نہ بتاتا کہ اسلامی دستور ہے کیا؟ اسلامی تہذیب کسے کہتے ہیں؟ اسلامی نظریۂ تعلیم ہے کیا؟ —— پرویز صاحب نے نعروں کے اُس اندھیرے میں فکر کی شمعیں روشن کیں۔ فکر بھرپور تھی لیکن شمع کی لو مدہم تھی۔ وسائل اور ذرائع محدود جو تھے۔ آخر (۲۳۔ نیپئر بارکس میں) نیم کے ایک درخت کے نیچے پرویز کی آواز بلند ہوئی۔ آہستہ آہستہ طلوعِ اسلام کی تحریروں کی طرح یہ آواز بھی پھیلنے لگی۔ نت نئے دائرے بناتے ہوئے۔

قرآن کے پیغام کے تقاضے شدید ہوتے گئے۔ پرویز صاحب نے روح کی بےچینیوں سے مجبور ہوکر قبل از وقت ملازمت چھوڑ دی۔ قرآن کا پیغام اُن کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا بن گیا۔ قرآن نے آواز دی اور وہ لبیک لبیک کہہ کر اس کو ندا کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ پڑے —— اُن کی آواز کراچی کی حدود کو پار کرکے صحرائے سندھ پہنچی جس کے ذرّوں نے کبھی محمد بن قاسم کے ساتھیوں کے قدم چومے تھے۔ پنجاب کے دریا قرآن کے پیغام سے اسی طرح لرز گئے جیسے کبھی دریائے نیل ایک خطبے سے کانپ اٹھا تھا۔ سرحد کے پہاڑوں نے اس پیغام کو اس طرح اپنے سینے میں جگہ دی جیسے نرم اور شاداب مٹی بیج کو اپنی گود میں چھپا لیتی ہے۔ پرویز صاحب اس بلاوے کو کب تک نظر انداز کرتے۔ آخر ۵۸ء کے اپریل میں وہ کراچی سے لاہور چلے گئے۔ اپریل کا مہینہ جب لاہور اور مغربی پاکستان میں گلاب کے شگوفے رنگ و بو کی ایک دنیا اپنے آغوش میں چھپائے ہوتے ہیں۔ بہاروں کا داعی، جنتِ ارضی و سماوی کا نقیب اُسی مہینے میں کراچی سے چلا گیا۔ دل نے سخت احتجاج کیا۔ ذہن نے سمجھایا کہ یہ اللہ کے راستے کا سفر ہے۔ چپ رہو خاموش رہو۔

اور پھر دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب ہم (یں، ام عاکف اور خود عاکف) اقبال کے دیس لاہور گئے (یہ محض کہنے کی بات ہے ورنہ

— مگر اُس کا نہ دِلّی، نہ بخارا نہ سمرقند) تو ہم نے دیکھا کہ آج ملتان میں قرآن کے پروانوں کے درمیان وہ شمع جل رہی ہے۔ تو کل اُسی شمع سے شبستانِ جہلم روشن ہے۔ پشاور، راولپنڈی۔ لائلپور۔ مری۔ یہ آواز قلبِ لاہور سے ہر طرف پہنچ رہی ہے اور میں مطمئن ہو گیا میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اچھا ہوا پرویز صاحب کراچی سے چلے آئے۔

ادھر کراچی میں قرآن حکیم کے وابستگانِ دامن کے لئے یہ بات کتنی اذیت ناک تھی کہ انھوں نے پرویز صاحب کو مایوس کیا یہ شہر اشاعتِ فکرِ قرآنی کا حقیقی مرکز نہ بن سکا۔ لیکن دلوں پر مایوسی غلبہ نہ پا سکی۔ قرآن نے کہا کہ وہ اللہ ہی تو ہے جو رات سے دن کو پیدا کرتا ہے۔ عمل کی رفتار بڑھتی گئی اور جب قانونِ الٰہی انسانی عمل سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو — طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے — میاں عبدالخالق اور دوسرے رفیقانِ سفر (آخر ہماری زندگی قرآنی نظامِ حیات کی طرف ایک سفر ہی تو ہے] کی جدوجہد سے ٹیپ ریکارڈ خریدا گیا۔ ہر اتوار کو پی ایم ٹی بلڈنگ ہال میں نو بجے پرویز صاحب کی آشنا، نرم اور استوار آواز سنائی دینے لگی۔ ٹوٹا ہوا سلسلہ جڑ گیا۔ کتب خانے قائم ہوئے۔ گھر گھر لٹریچر پہنچایا گیا۔ کراچی کی فضا پھر قرآنی نغمات سے معمور ہونے لگی۔

پرویز صاحب کے لاہور چلے جانے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء کا انقلاب آیا تھا۔ اس انقلاب کو ہم نے الا اللہ سے پہلے لا کی منزل جانا۔ کہانیوں کی نانی اماں نے کانوں میں آکر آواز دی — "پرانے محل گرتے ہیں نئے محل اٹھتے ہیں" — پرانے محل گر گئے ان کے ملبے کے نیچے دبے ہوئے ساتھیوں کا دم گھٹنے لگا۔ پرویز صاحب یاد آئے۔ نئی تعمیر کے لئے نیا پیغام قرآن کی روشنی ہیں۔ میاں صاحب نے خط وکتابت کی۔ پرویز صاحب انکار کیسے کرتے؟ کیونکر کرتے؟ یہ نہ اُن کا کام تھا نہ ہمارا۔ ان کا جواب آیا۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

پرویز صاحب کو یہ پتہ نہیں کہ اُن کے آنے کے ساتھ ہی ہمارے لئے گیا وقت بھی لوٹ آئے گا۔

ابھی میں اور بھی نہ جانے کیا کیا سوچتا کہ حسنین نے آکر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ چپکے سے۔ میں چونک اٹھا۔

"کیا کر رہے ہو۔ چلو۔ بیچ لگژری چلنا ہے۔ دیر ہو گئی"

گاڑی سڑک پر دوڑتی رہی اور ہم بیچ لگژری پہنچ گئے۔ یہاں میاں عبدالخالق تھے دروازے پر خوش آمدید کہنے کے لئے۔ (آخر اس کی کیا ضرورت تھی)۔ ملک سعید تھے اور اُن کی نگاہوں میں بڑی چمک تھی کہ اب جلسے ہوں گے اور میری انتظامی صلاحیت پھر سے جلا پائے گی۔ شفیع صاحب کی مسکراہٹ تھی اور انور صاحب کی سنجیدگی۔ حافظ برکت اللہ صاحب بھی ہر جتن سے اپنی مصروفیت کو بڑھا رہے تھے۔ اسد حمید صاحب۔ چودھری عبدالشکور اور دیگر ستارے جو ڈیڑھ سال قبل تک اُس مہرِ آسمانِ قرآنی کے گرد محوِ کسبِ ضیا رہتے تھے۔ سب موجود تھے۔

ہری گھاس پر ایک کنجِ تنہائی میں ہم صفیرانِ چمن جمع ہو گئے۔ سامنے سمندر کی موجیں۔ ایک دوسرے سے لپٹتی ہوئی۔ کھیلتی ہوئی۔ انھیں کون ایک دوسرے سے الگ کر سکتا ہے؟ میں نے سوچا کہ ہم بھی تو قرآنی سمندر کی موجیں ہیں۔ ایک دوسرے سے وابستہ

اور پیوست۔ ہمیں کون الگ کر سکتا ہے؟ ہمارا یہ تعلق تو غیر متبدل اقدار نے قائم کیا ہے۔ یہ خون کا رشتہ نہیں کہ اب وجد کی جائیداد توڑ دے۔

اور تھوڑی دیر کے لئے میری آوارہ خیالی باہمی مشورت میں بدل گئی۔ کتنے ہی مسائل سامنے تھے۔

اجتماعات کے لئے روپیہ کہاں سے آئے؟

ہر آواز دوسری آواز پر سبقت کرنے لگی۔ "یہ میرا حقیر سا حصہ ہے"..... لیجئے مسئلہ ختم ہو گیا۔

"پرویز صاحب کہاں ٹھہریں گے؟"

"میرے یہاں" — "میرے یہاں" — "میرے غریب خانہ پر" "میرے گھر کو کیوں نہ عزت بخشیں" اس مسئلہ کا سلجھنا مشکل ہو گیا۔ طے ہوا کہ پرویز صاحب پر اس مسئلہ کو چھوڑ دو۔

اجتماعات کہاں ہوں گے؟ باہمی تعاون نے اس مسئلہ کو بھی لمحوں میں حل کر دیا۔ ہم اپنی تاریخ کے نئے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ اسی لئے ہر اجتماع کا ایک مقصد ہونا چاہیئے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ اہم ترین مسائل پر قرآنی نقطہ نظر معلوم کیا جائے خالد اسحٰق صاحب نے کہا کہ "ایک تقریر بار ایسوسی ایشن میں ہو۔ "اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول" کے موضوع پر" ٹھیک ہے۔ سب نے کہا۔

میں نے کہا کہ طلبا اور اساتذہ کا حق تو سب سے پہلے ہے۔ طلبا سے پرویز صاحب کو سب سے زیادہ محبت ہے۔ وہ سڑک پر چلتے ہوئے اسکول کے بچوں کو سلام کرتے ہیں۔ کالج کے لڑکوں کے کسی سوال سے آزردہ نہیں ہوتے۔ اُن کی پریشان نظری کا دارو تلاش کرتے رہتے ہیں طے ہوا کہ ایس۔ ایم لا کالج میں طلباء کا اجتماع ہو گا اور پرویز صاحب "انسان اور کائنات" کے موضوع پر بولیں گے۔

غرض یوں ہی دو ہفتوں کا پروگرام مرتب ہو گیا۔ درمیان میں ایسے دن بھی رکھے گئے جب کوئی تقریر نہ ہو تاکہ لوگ پرویز صاحب سے مل سکیں اور اپنے سوالات کے جواب اُن سے حاصل کر سکیں۔ جب شام رات بن گئی تو یہ مشاورتی جلسہ ختم ہوا۔

اِدھر جلسہ ختم ہوا اور اُدھر شہر میں دو ہی ایک دن میں پرویز صاحب کی آمد آمد کی اطلاع تھی۔ کتنے ہی چہرے کھل اٹھے۔ کتنے ہی سکڑ گئے۔ اتوار کو درس کے ریکارڈ کے بعد میاں صاحب نے دوسرے ساتھیوں تک یہ خبر پہنچا دی۔ پھر کچھ نہ پوچھئے۔ یہ درمیانی دن ساتھیوں اور قرآنی دوستوں نے کس طرح گذارے۔ وقت آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔ جہانِ گذران جس سے ہمیشہ تیز رفتاری کی شکایت رہی ہے اُس سے ہم آبلہ پائی کا گلہ کرنے لگے۔ حالانکہ یہ درمیانی مدت انتہائی مصروفیتوں میں گزر رہی تھی۔ لوگوں کو اطلاع دعوت نامے چھپوانا تقسیم کرنا۔ اجتماعات کے دوسرے انتظامات۔

روز روشن آگیا

آخر اگست کی ۲۳ تاریخ آگئی۔ ۲۳ اگست کو اتوار تھا۔ صبح قرآنی احباب درس میں جمع ہوئے اور درس کے بعد ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے رہے۔ یہ ایک فرد کے آنے کی خوشی نہ تھی بلکہ وہ آرہا تھا جس نے ہمارے کانوں تک قرآن کا مفہوم پہنچایا تھا جس نے ہمیں روایات کی زنجیروں سے آزادی دلائی تھی۔ پرویز صاحب کو بارہ برس ہمارے

درمیان رہے تھے اور اس ساری مدت میں کبھی ذہن میں خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ کہیں اور چلے جائیں گے۔ اور اُن کے جانے سے قلب و نظر کی مہجوری کا یہ عالم ہو جائے گا۔

سورج کی روشنی ہو یا ہوا۔ ہم میں سے کون اِن چیزوں کی قدر و قیمت کا احساس کرتا ہے۔ لیکن اگر کئی دن سورج بدلیوں میں چھپا رہے اور فضا میں حبس ہو تو پھر ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فطرت کی انھیں نعمتوں کی طرح پرویز صاحب کے فکر روشن کی نعمتیں ہمارے لئے فراواں تھیں جب تک وہ کراچی میں تھے اور جب وہ چلے گئے تو پتہ چلا کہ بزم سے ان کے اٹھتے ہی ستاروں کے چراغ جھلملا اٹھے تھے اور حسنِ شبِ مہتاب اُن کے ساتھ ہی روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اب ہم ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ

ماہ سوئے آسماں آید ہمی اور

سرو سوئے بوستاں آید ہمی

یہ دن یوں کٹا کہ غالب یاد آ گئے ــــ صبح کا شام کرنا، جوئے شیر کا لانا ہو گیا ــــ غالب کی یہ بات ہمیشہ مبالغہ انگیز معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن اس کی صحت کا یقین ہو گیا۔ لیکن سرِ شام یہ اطلاع ملی کہ اس سہ پہر لاہور سے جہاز روانہ نہیں ہو سکا۔ اس لئے پرویز صاحب ۲۴ کی صبح کو پہنچیں گے۔

۲۴ کی صبح کراچی کے ہوائی اڈے پر کتنی ہی نگاہیں منتظر تھیں اور جس طرح ہر راہ رو کسی آنے والے کا گمان ہوتا ہے اسی طرح ہر آنے والے طیارے پر پی۔ آئی۔ اے کے لاہور سے آنے والے جہاز کا یقین ہو جاتا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ نو بج گئے۔ پی آئی اے کا طیارہ جو دور سے ستارہ معلوم ہو رہا تھا۔ الف لیلیٰ کے "رُخ" کی طرح پر تول کر زمین پر اترنے لگا۔ جہاز زمین پر آ کر رک گیا۔ مسافر اترنے لگے۔ آخر پرویز صاحب نظر آئے اور اُن سے پہلے ان کی وہ مسکراہٹ جو اُن کی شخصیت کا امتیازی نشان ہے۔ اُن کی مسکراہٹ بڑی فطری ہے۔ وہ ایسے مسکراتے ہیں جیسے شاخوں پر پتیاں پھوٹتی ہیں۔ بے تکلف۔ فطری انداز۔

اور پھر پرویز صاحب ہجومِ دوستاں میں گم ہو گئے۔ گم کہاں ہوتے۔ اُن کی عقابی نگاہیں حیرت ناک تیزی کے ساتھ پلٹیں اور وہ ہر ایک سے ایسی بات کہتے جو اُسی سے کہی جا سکتی تھی۔ دوستوں کے اس اجتماع میں ہر ایک کی انفرادیت کا یا احترام۔

جب جذبات کی یہ بارش رُکی تو قافلہ شیخ محمد شفیع محمد انور صاحبان کے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ میزبانی کی سعادت ان کے حصہ میں آئی۔ انتخاب پرویز صاحب کا تھا۔ اسی لئے کسی کے دل پر میل نہ آیا۔ طے بھی تو یہی ہوا تھا۔ شفیع صاحب اور انور صاحب کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

آخر یہ قافلۂ بہار منزل پر پہونچ گیا۔ دیر تک پرویز صاحب باتیں کرتے رہے۔ آج آسمان کی گردش ہار چکی تھی۔ یہ اُن لوگوں کا مجمع تھا جو ستارے کو فراخیٔ افلاک میں زار و زبوں دیکھتے ہیں اور اپنی زندگی کو ستارہ بنانے، پھر اسے توڑنے اور پھر آفتاب بنانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ آج غالب کے اس شعر کا عملی مفہوم سامنے آ گیا تھا کہ

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالب بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

۲۴ر اگست

۲۴ر اگست کی صبح پرویز صاحب کے لئے بڑی کشمکش لے کر آئی تھی۔ وہ نیپئر بیرکس گئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ایک نیم کے درخت کے سائے تلے ایک مقرر ہوتا تھا اور دو اس کے سننے والے۔ مقرر پرویز صاحب اور پہلا اوّل اور سابق ڈاکٹر سعید مرحوم اور سبحانی مرحوم تھے۔ ڈیڑھ سال کی اس مدت میں پرویز صاحب سبحانی صاحب کو کھو بیٹھے۔ وہ سبحانی جس نے کتنے ہی کام اپنے سر لے لئے تھے اور تیس برس تک اس وضع کو نبھاتے رہے تاکہ پرویز صاحب کا وقت ان مکروہاتِ زمانہ کی نذر نہ ہو۔ جن کی نگاہیں ہمیشہ پرویز صاحب کو تکتی رہتیں، اور ادھر کسی چیز کا اظہار پرویز صاحب کے چہرے سے ہوا، ادھر سبحانی نے وہ کام پورا بھی کر ڈالا۔ ڈیڑھ سال کی یہ مدت اس اعتبار سے کتنی سنگین تھی۔ پرویز صاحب نیپئر بیرکس میں جتنی دیر رہے اُن کی نگاہیں دور۔ بہت دور خلاء میں جانے کیا کچھ دیکھتی رہیں۔ "یہ میرا مکان تھا۔ جہاں میں نے معارف القرآن کے کتنے صفحوں کو روشنائی سے نہیں بلکہ پلکوں کی شبنم سے لکھا ہے۔ یہ ہے وہ نیم کا درخت جس کا پھل، یہ میٹھی اور شیریں تحریکِ اشاعتِ فکرِ قرآنی ہے۔ اور یہ ہے سبحانی کا مکان۔ وہ میرا دوست۔ میرا بھائی۔ میری قوتِ بازو۔ یہی مکان دوسرا مرکز بنا ہمارا اس شہر میں۔" سوچتا ہوں کہ پرویز صاحب یہی کچھ تو سوچ رہے ہوں گے۔ محبت کے یہی تو وہ لمحے ہوتے ہیں جب آدمی بچپن کی معصومیت اور تجربے کی حدود کو چھو لیتا ہے۔

اگر میں ان تاثرات اور اس رپورتاژ میں پرویز صاحب کی ہر مصروفیت کو شامل کر دوں تو ورق تمام ہو جائے گا اور بات رہ جائے گی۔ میں اپنے آپ پر اور آپ پر ظلم کرتے ہوئے یہ طے کرتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے گا صرف اجتماعات تک اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔

۲۴ر اگست کو رات کے ساڑھے نو بجے پی۔ ایم۔ اے ملڈ   میں درسِ قرآن تھا۔ اسی ہال میں ہر ہفتہ پرویز صاحب نے درس کا ریکارڈ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اُس رات کو تنگیٔ ہال الخالق کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا۔ ہال سمٹ کر چھوٹا سا کمرہ بن گیا۔ باہر کی گیلری بھر گئی۔ اب آنے والوں کو کہاں بٹھائیں۔ ہال اوپر کی منزل پر ہے۔ لوگوں نے سیڑھیوں پر ڈیرا ڈال دیا۔

وقت پر درس شروع ہو گیا۔ کل تک آواز سنتے تھے اور ذہن اپنے پردہ پر مقرر کا خاکہ بناتا تھا۔ آج سامنے پرویز صاحب تھے۔ میں اپنے آپ کو نظری اعتبار سے اچھا مسلمان سمجھتا ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور ہر باب میں آج بھی انسان کی نظر خوگرِ پیکرِ محسوس ہے۔ آخر اللہ میاں نے آنکھیں جو دی ہیں۔ آج دل، آنکھیں، کان سبھی اپنا حصہ پا رہے تھے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک

درس کا موضوع تو تھا "سورۂ فاتحہ کے الفاظ کی تشریح پرویز صاحب کے اُس لغت کی رُو سے جو ابھی زیرِ طباعت ہے" لیکن قرآنی حقائق کا کونسا گوشہ تھا جو اس کے اندر سمٹ کر نہیں آ گیا تھا۔ درس کیا تھا۔ جیسے نور کی مستانہ روی کا منظر تھا۔ کون ہے جو زبانِ پرویز سے قرآنِ حکیم کی تفسیر ایک بار سُنے اور پھر ساری زندگی کبھی یہ کہہ سکے کہ (خاکم بدہن) قرآن کلامِ بے ربط ہے۔ تصریفِ آیات۔ حوالۂ ربطِ معانی و اسلوب اور پھر اپنے دور کی بلند ترین علمی سطح۔ آج بہت دنوں کے بعد یہ سب کچھ ہمارے تصرف میں تھا۔ گیارہ پونے گیارہ بجے کے قریب جب درس ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ گھڑی کی سوئی کیا کہہ رہی ہے۔ درس کے بعد اب لوگوں کی ٹولیاں اپنے اپنے طور پر درس کی باتیں کر رہی تھیں۔ افہام و تفہیم کی کوششیں جاری تھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کتنے لوگ اُس رات قرآن کے پیغام کی لذتوں میں گم اپنے

گھر پیدل پہنچے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو موجودہ معاشرہ کی اونچ نیچ کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ اپنے لئے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لئے۔ یہ اُس دن کے منتظر ہیں جب قرآنی نظام انسانی معاشرہ میں ایک عملی حقیقت بن جائے گا۔ اور اب اِن سب کو یقین ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں۔ پہلے ہم اپنے آپ سے پوچھتے تھے ؎

کیا جانیئے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانیئے کب وہ دن آئے
جس دن کے لئے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

اور اب آنے والے دور کی جو دھندلی سی تصویر سامنے آتی ہے، وہی منزل کی نوید ہے۔

۲۵ اگست

۲۵ اگست کی شام کو پرویز صاحب کی بہت ہی اہم تقریر تھی ــــ "اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول" ــــ اور یہ تقریر تھی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے جانب سے، عدالتِ عالیہ کی عمارت میں۔ علامہ اقبال کے بعد قانون سازی اور فقہ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے متعلق پرویز صاحب کے علاوہ کسی نے ایسا مربوط نظامِ فکر نہیں پیش کیا جو قانون سازی کی اساس بن سکے۔ پرویز صاحب کی یہ تقریر قرآن فہمی، قانونی بصیرت، اسلامی مملکت کی ساخت کے واضح تصور اور عملی نقطۂ نگاہ کا ایک توازن پذیر مجموعہ تھی۔ اس پر اضافہ کیجئے "منطقی استدلال اور جذبات کی اُس گہرائی کا، جہاں پہنچ کر ہر جذبہ فکر بن جاتا ہے۔ تقریر میں الیسار لبط جو زینہ کی سیڑھیوں میں ہوتا ہے۔ مثالیں ایسی جامع جو مسئلہ کے ہر پہلو کو واضح کریں۔

پرویز صاحب نے قانون کے فاضلوں کے سامنے اسلامی قانون سازی کے نکات واضح کئے۔ آپ نے انھیں بتایا کہ اسلامی فقہ میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہو سکتا ہے کیونکہ جن لوگوں نے فقہ اسلامی کو مرتب کیا تھا انھوں نے اپنے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھا تھا۔ وہ تقاضے بدل گئے ہیں۔ ہم نئے حالات سے دوچار ہیں۔ اسلام کے وہ غیر متبدل اصول اور قدریں جو ہمیں قرآن نے عطا کی ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اُن کے علاوہ ہمیں اختیار ہے کہ ہم حدود اللہ کے اندر رہ کر اپنے لئے آپ قوانین بنائیں۔

میرے ایک وکیل دوست تقریر کے بعد کہنے لگے کہ "مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں پرویز صاحب کسی علماء بورڈ کی تجویز نہ پیش کر دیں۔ کہ مجلس قانون ساز کا منظور شدہ قانون اُس بورڈ کے سامنے آخری اور قطعی منظوری کے لئے پیش کیا جائے"۔ مجھے ہنسی آئی لیکن میں نے اسے خندۂ زیر لبی سے آگے نہ بڑھنے دیا اور پھر وکیل صاحب کو بتایا کہ ایسے بورڈ کے خلاف سب سے پہلے پرویز صاحب ہی نے طلوعِ اسلام میں بڑے زور سے لکھا تھا اور اسے دو عملی حکومت قرار دیا تھا"۔ وکیل صاحب شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے۔ "سچ پوچھئے تو میں نے پرویز کو خود نہیں پڑھا۔ دوسروں سے ضرور سُنا ہے کہ بدعقیدہ آدمی ہے"۔ ــــ جواباً عرض کیا ــــ "خدا آپ کو کبھی جج نہ بنائے"۔

۲۷ اگست

کہا جاتا ہے کہ کراچی میں پبلک ہال نہیں ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ کراچی کے پبلک ہال مرثیہ خواں ہیں کہ آنے والے نہیں۔ یہاں کے ہالوں کی وہی حالت ہے۔ جو اقبال کے شکوہ کی مسجدوں کی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

ہاں اگر کوئی محفلِ رقص و سرود ہو تو شوق کی بلندی، ہال کے حوصلوں کی پستی کو آشکار کر دیتی ہے۔ لیکن میں نے کسی سماجی یا ذہنی دینی تقریب کے موقع پر شہر کے کسی ہال کو پوری طرح بھرا ہوا نہیں دیکھا۔ میری یہ حسرت اور تمنا، ۲۰ اگست ۱۹۵۹ء کو پوری ہو گئی جب تھیوسوفیکل ہال (جمشید میموریل ہال) لوگوں سے اس طرح پُر تھا جیسے کسی قیدی کا سینہ آزادی کی تمنا سے بھرا ہوا ہو یا قلبِ مومن حسین افکار سے ــــ آج شام پرویز صاحب کی تقریر کا موضوع تھا ــــ "قرآن کا معاشی نظام" اقبال نے بہت پہلے لکھا تھا۔ کہ روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا جا رہا ہے"۔ اور اسی مسئلہ کو انھوں نے اسلامی ریاست کے قیام کی ایک بنیاد قرار دیا تھا۔

اقبال کے یہاں بات اشاروں سے آگے نہ بڑھی تھی، کیونکہ آخر عمر میں اِن خیالات کا اظہار انھوں نے قائداعظم کے نام اپنے خطوں میں کیا تھا۔ پرویز صاحب نے اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں انتہائی شرح و بسط سے پیش کر کے یہ بتا دیا۔ "کہ قرآن (نظر بہ الظاہر) بولتا تو "مذہب" کی اسٹیج سے ہے لیکن "دنیاداری" کا کوئی سوال ایسا نہیں جس کا صحیح حل نوعِ انسانی کے سامنے پیش نہ کر دیتا ہو۔ اس سے "فکرِ معاش" میں سر کھپانے والوں کو اس امر کا احساس ہو گیا کہ ان کی جدوجہد دین سے دوری نہیں۔ یہی وہ احساس تھا جو اُس شام لوگوں کو کشاں کشاں کھینچ لایا تھا۔ ہال بھر گیا۔ گیلری بھر گئی۔ ہال کے باہر پڑی ہوئی کرسیاں پُر ہو گئیں۔ آج میاں عبدالخالق کی نگاہوں میں بڑی چمک تھی اور یہ چمک کہہ رہی تھی کہ "چوہدری صاحب! اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ ہم کراچی والے فکرِ قرآنی سے کس قدر وابستہ اور قریب تر ہو گئے ہیں"۔

پرویز صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ اس دورہ کی پہلی عام تقریر (درس کے علاوہ) لہجہ میں جوئے کہستاں کی سی تندی جو پہاڑوں کے دل چیر دے، الفاظ میں حسن خیالات میں منطقیانہ تسلسل اور عاشقانہ حرارت کا امتزاج۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر کو نعوذ باللہ "مسکینی" سمجھنے والوں نے جب یہ سنا کہ "وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا"۔ اور یہ کہ "خوف اور بھوک اللہ کا عذاب ہے"۔ اور "اِس دنیا کا اندھا اُس دنیا میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا"۔ تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے بہت کم اتنے آدمیوں کے وجود کو کسی جلسہ میں لرزتے دیکھا ہے۔ کتنی ہی آنکھیں آنسوؤں سے وضو کر رہی تھیں۔ اور یہ ایسی آنکھیں تھیں جو کاروبارِ حیات کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ ہیں۔ جو اب حقیقت سے کم کسی چیز کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتیں۔ سلیم اللہ تمنی جو افکارِ تازہ کے جوہری ہیں۔ ڈاکٹر سید ہدایت اللہ جن کی زندگی سائنس کے اہم تجربوں میں گزری ہے ..... یہ، اور ہم اور تم ـــــ

ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے۔

پرویز صاحب نے قرآن کے معاشی نظام کے بنیادی خد و خال کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ "اسلامی معاشرہ اور ریاست میں زمین اور ذرائع پیداوار کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ ذخیرہ اندوزی اور زراندوزی کی اجازت نہیں مل سکتی۔ سرمایہ کی گردش لازمی ہے۔ سرمایہ چند افراد کے قبضہ میں نہیں ہوگا بلکہ پوری قوم میں گردش کرے گا۔ سوائے معذوروں اور اپاہجوں کے ہر شخص کو کام کرنا پڑے گا"۔ یہ باتیں سن کر میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے دو نوجوان ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "یہ اسلام کب ہے اشتراکیت ہے"

اچانک اُسی وقت پرویز صاحب کی آواز گونجی "اشتراکیت اور اسلام ایک دوسرے کی کامل ضد ہیں۔ ان کے درمیان سمجھوتہ ممکن نہیں۔ چند ظاہری مشابہتوں پر نہ جایئے۔ اسلامی نظریۂ حیات اور اشتراکی فلسفہ میں فرق ہے۔ اسلام نے روحِ انسانی کو آزادی اور انسانی ذات کو ارتقاء کا جو پیغام دیا ہے اُس نور سے قلبِ اشتراکیت بالکل محروم ہے۔" اور پھر اسلام و اشتراکیت کے مقابلہ و تجزیہ میں شمشیر کی سی تیزی آگئی۔ جلسہ کے بعد میں اُن نوجوانوں سے ملا۔ وہ کہنے لگے کہ "آج ہمیں معلوم ہوا کہ اسلام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے خلاف ہے کیونکہ معاشی توازن کی راہ نہ یہ ہے نہ وہ۔ اس نظام کو قرآنی معاشی نظام کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ ہم معاشیات کے طالب علم ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ انقلابی خیالات ہم جدید معاشی زبان میں بھی پیش کر سکے تو یورپ لرز اٹھے گا۔"

تقریر کے بعد حسب معمول یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دی گئی تو مختلف اطراف سے سوالات کی پرچیاں برسنے لگیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پرویز صاحب کی گہری شخصیت اور حقیقی جوہر کی نمود سوالات کے جواب کے وقت ہوتی ہے۔ اول تو یہ کہ سوالات کی کثرت سے وہ کبھی نہیں بگڑتے۔ پھر یہ کہ بعض سوالات کچھ عجیب تند و تلخ لہجہ لئے ہوتے ہیں۔ لیکن کیا مجال جو مجیب کی فطری مسکراہٹ میں ذرا سی بھی کمی واقع ہو اور ان کی پیشانی پر ہلکا سا بل بھی دکھائی دے۔ اور سب سے آخر یہ کہ جوابات مختصر سے مختصر الفاظ میں استدلال کی پوری جامعیت لئے ہوئے اور اس کے ساتھ انداز بیان ایسا شگفتہ جیسے محفل پر پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اہل محفل کا دلی تقاضا ہوتا ہے کہ سوالات کا وقت تقریر کے وقت سے کبھی کم نہیں ہونا چاہیئے۔

جلسہ کی صدارت کے فرائض، کراچی کے ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل، خالد اسحٰق صاحب نے سرانجام دیئے۔ جنھوں نے قرآنی نگاہ اور (اس بنا پر) پرویز صاحب سے قلبی تعلق، اپنے والد مکرم، خان صاحب اسحٰق بدر الدین (مرحوم) سے ورثہ میں پائے ہیں کم دیکھا گیا ہے کہ پرویز صاحب نے خان صاحب مرحوم کا ذکر کیا ہو اور ان کی آنکھوں میں آنسو نہ بھر آئے ہوں۔ قرآنی فکر سے ہم آہنگی کا رشتہ بھی کیا رشتہ ہے؟

۲۸ اگست آج دن کے کئی گھنٹے شفیع صاحب کے مکان پر گذرے۔ اُن کے ہاتھ پیر مشینی انداز کی طرح چل رہے تھے اور چہرے کی ہر لکیر انسانی محبت کی کہانی کہہ رہی تھی۔ وہی نہیں اُن کے گھر کا ہر فرد۔ انور صاحب سے لے کر بچے تک سبھی نازاں تھے کہ پرویز صاحب اُن کے گھر ٹھہرے ہیں۔

فہمی صاحب نے ایک بار بڑے مزے کی بات کہی تھی کہ "اتنے آدمیوں کی عقیدت کا مرکز ہوتے ہوئے بھی پرویز صاحب نارمل آدمی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔" دوستوں اور ساتھیوں کی محفل میں پرویز صاحب کو دیکھیئے تو فضا میں اقبال کا یہ مصرعہ سنائی دیتا ہے ع ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ——— باتوں میں پھولوں کی مہک، ہر شخص کی طرف تخاطب، مزاج ایسا جیسے سرسوں کا تختہ کھلا ہو یا بارش کے بعد نرم سی دھوپ نکل آئے ——— اردو ایسی بولیں گے کہ اردو کے اسالیب کی وسعت پر رشک آجائے اور پنجابی کی یہ کیفیت کہ اس میں مٹی کی سی سوندھی سوندھی خوشبو کا احساس ہو۔ سارا دن بڑی کیفیتوں میں گزرا۔

رات کو سوا نو بجے پی ایم اے بلڈنگ میں درسِ قرآن تھا۔ میں کوئی آٹھ بجے وہاں پہنچ گیا۔ ابھی کافی دیر تھی لیکن آدھی نشستیں پُر ہو گئی تھیں۔ باہر چند مولوی صاحبان ایک صندوق بھر پمفلٹ اور کتابچے لئے کھڑے تھے۔ وہی انکارِ حدیث، وہی منکرِ حدیث.... سامنے پی ایم اے بلڈنگ کے صدر دروازے پر روشنی کے سیلاب میں یہ عبارت جگمگا رہی تھی۔ "وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔" یہ صرف محققوں کی روشنی نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے نظامِ قرآنی کی درخشانی بھی تھی۔ مولوی صاحبان میں سے ایک سے میں نے کہا۔ "آیئے۔ یہ قرآنی نظام ہمارا آپ کا، سب کا ہے۔ چل کر پرویز صاحب کی بات تو سن لیجئے۔ پھر قرآن کی یقین دہانی ہمارے ساتھ ہے کہ جو اس نظام میں داخل ہوا اس کے لئے امن ہے۔" بگڑ کر کہنے لگے۔ "یہ قرآنی نظام آپ کو ہی مبارک ہو۔" میں ان سے کیا کہتا! ہاں اگر حضورِ حق تعالیٰ یہ گفتگو ہوتی تو اقبال کا ہم نوا ہو کر کہہ دیتا کہ

"خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت"

پچھلے درس میں جگہ کی کمی بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ اس بار بلڈنگ کے وسیع احاطہ میں شامیانے لگے تھے اور چھ سات سو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری کرسیاں بھر گئیں اور قرآن کے کتنے ہی طالب علم ہر چہار طرف کھڑے تھے۔ بیبات اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی معلوم ہوتی تھی اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لوگ کس تیزی سے قرآن کی طرف کھنچے آ رہے ہیں۔

درس ساڑھے نو بجے شروع ہوا۔ آج کے درس کا موضوع تھا "تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟" عنوان ہی اپنی وضاحت آپ کرتا ہے۔ سوال انکارِ دین کا نہ تھا تکذیبِ دین کا تھا۔ آج نشتر کی زد "شریانِ قیسِ ناتواں" کی طرف تھی اور اس مسئلہ کی وضاحت اور بار بار اعادہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ پرویز صاحب نے نظامِ ربوبیت کا نیا تصور پیش کیا ہے اور ردی کو دین کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جس قدر اسلام۔

جب پرویز صاحب نے کہا کہ "جو لوگ دین کے مدعی ہیں جب ان کی زندگی دین کو جھوٹا ثابت کرتی ہے تو برادرانِ عزیز! سوچئے جرم کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ تو کتنی ہی روحیں لرز گئیں۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ اَرَءَيْتَ کا لفظ دیکھئے۔ صرف ذہنی طور پر سمجھنے کا ذکر نہیں۔ بات ہے دیکھنے کی محسوس شکل میں۔ پہلے ہی ٹکڑے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ آگے کسی نظری مسئلہ یا عقائد کا ذکر ہوگا لیکن دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کی روزی کے لئے ترغیب نہیں دیتا۔ اب غور کیجئے کہ ردی کے مسئلہ کا ڈانڈا کس بات سے جا ملتا ہے؟ تکذیبِ دین سے۔

آج پرویز صاحب کی تقریر کا ہر ٹکڑا یقین اور ایمان کے نرم رو تاصد کی طرح پیامِ زندگی لئے نظر آتا تھا۔ دل نے اپنے دروازے کھول دیئے اور یہ خیالات، مہمانِ عزیز کی طرح ہمارے سرائے دل میں مکین ہو گئے۔ کتنا بے رحمانہ تھا ان کا تجزیہ۔ بے رحمانہ یوں کہ ہماری روشِ زندگی قرآن سے بہت دور ہٹ گئی ہے اور قرآن تو فرقانِ مبین ہے۔ وہ اللہ کے قانون کی طرح رعایت نہیں کرتا۔ یہ ایسا آئینہ ہے جو حقیقتوں کو حقیقی رنگ میں پیش کر دیتا ہے۔

عربی میں یتیم تنہا کو کہتے ہیں (اردو میں بھی یہ پہلو موجود ہے ـــ دُرِّ یتیم) آج ہم میں سے جس کی زندگی میں کوئی مصیبت آتی ہے وہ اس بھری محفل میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ غلط معاشرہ میں ہر شخص یتیم ہوتا ہے۔ آج کا معاشرہ تنہا لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ ایک امریکی کتاب کے نام کے مطابق (LONELY CROWD) ہے۔ یہاں کوئی تنہا آدمی کی تکریم نہیں کرتا۔ قرآن نے انسان کو بحیثیت انسان اور بنی آدم کے واجب التکریم قرار دیا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ جو معاشرہ اس حقیقت کبریٰ کو بھول جاتا ہے وہ کچھ عرصہ کے بعد ذلیل ہو جاتا ہے۔ آج ہم اپنی قومی بھوک اور اقوام عالم کے سامنے اپنی گداگری سے اپنے دین کو جھوٹا ثابت کر رہے ہیں۔"

اور پرویز صاحب نے ان الفاظ میں مسلمان کی زندگی کے نصب العین کو پیش کیا: "قرآن کی رُو سے زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ دنیا کو ایک ایسی جنت بنا دو جہاں کوئی بھوکا نہ رہے۔ کوئی بے گھر نہ ہو۔ جہاں کسی کو خوف نہ ہو، نہ حزن یعنی اس کے ذہن کی کسی تہہ اور کسی کیفیت میں یاس کا رنگ نہ ہو۔ اس دنیا کو جنت بنانے کے بعد ہی ہم جنتِ سماوی اور آنے والی بہتر زندگی کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اس دنیا کا اندھا اُس دنیا میں بھی اندھا اٹھایا جاتا ہے۔"

درس ساڑھے گیارہ بجے کے بعد ختم ہوا۔ لیکن لوگ ٹکڑیوں میں جلسہ گاہ میں بیٹھے موجودہ حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ دیر تک۔ آج کے مجمع نے ملک سعید کی روح میں عجیب بالیدگی پیدا کر دی تھی۔ جلسوں کا انتظام کوئی اُن سے کرنا سیکھے۔ نشر و اشاعت قرآنی کی اس مہم کو سر کرنے میں شاید ہی کوئی اُن سے بازی لے جا سکے۔ میں بارہ بجے رات کو اُن سے رخصت ہوا اور ایک بجے گھر پہنچا۔ یہ ایک گھنٹہ جیسے ایک لمحہ کی طرح بیت گیا۔ میں اپنے خیالات میں یوں گم تھا اور ان خیالات کا محور "تکذیب دین" کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

۳۰ اگست

آج صبح پھر درسِ قرآن کی مجلس کی آراستگی کا دن تھا۔ اور موضوع بھی ایسا جس سے روح جذب و انہماک اور سرور و شوق کی گوناگوں لذتوں میں کھو جاتی ہے۔ یعنی "مقامِ محمدی" اور مقرر پرویز۔

ع ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اُس کا

آج تذکرہ اُس ذاتِ گرامی کا تھا جس کے کردار و سیرت کی بلندیاں اہل عرب کے نزدیک قرآن کے کلام اللہ ہونے کی پہلی دلیل بنیں جس کا اسوہ حسنہ قرآن کا محبوب موضوع ہے اور اس کے اوراق اس کے حسنِ کردار کے اذکار سے پُر۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا ـــ ع کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است ـــ اس موضوع کی لذتوں کو ربیع الاول کی قربت نے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ آج عاشقانِ رسول کی تعداد جلسہ گاہ کی وسعتوں سے کہیں بڑھ گئی تھی۔

حسبِ دستور اِدھر پرویز صاحب کے مُنہ سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے الفاظ ادا ہوئے اور اُدھر کان حواسِ انسانی کا مجموعہ بن گئے۔ میری بات اُن کو کچھ یونہی سی معلوم ہوگی جنہوں نے پرویز صاحب کو بولتے نہیں سُنا۔ جو اُن کی تقریر کے تاثر سے آگاہ ہیں وہ ضرور داد دیں گے۔

"قوموں کی زندگی میں تہواروں کے کتنے ہی دن آتے ہیں لیکن مسلمان قوم تو ہمہ تن عمل بن کر تاریخ کی تاریکیوں سے اپنے جلو میں روشنی لئے ہوئے ابھری۔ اس قوم کو تہواروں کی فرصت ذرا کم ہی تھی۔ مگر ہمارے یہاں بھی دو تہوار ہیں ۔۔۔ جشنِ نزولِ قرآن اور جشنِ ولادتِ مصطفویؐ۔ اور سچ پوچھئے تو یہ دونوں تہوار بھی ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نقوش و حروف میں قانونِ الٰہی ہے اور سیرتِ مصطفویؐ ایک مجسم اور جیتا جاگتا قرآن۔ ہم خدا کو بھی جنابِ رسالتمآب کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ خدا کا صحیح تصوّر بھی حضرتِ محمد مجتبیٰؐ کی وساطت سے ہمارے سامنے آیا۔ اسی لئے قرآن اور خدا کو سمجھنے کے لئے مقامِ محمدیؐ سے آگاہی لازمی اور ناگزیر ہے"۔

اور اسی شخص کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کیا گیا کہ یہ "منکرِ شانِ رسالت" ہے۔ اِس الزام تراشی کے سلسلہ میں فیض کے اس شعر کو پڑھ دینا کافی ہے ؎

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

لیکن اب بات بدل گئی ہے۔ اہلِ ہوس تو خود ہی ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کا شوق منصفی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ ان اہلِ ہوس کو معزول کر کے ۔۔۔ کاش ان لوگوں نے پرویز کے خلاف کتابیں شائع کر کے جو روپیہ ضائع کیا ہے اُس سے سیرتِ محمد صلعم سے متعلق کتابچے اور رسالے شائع کئے جاتے اور لوگوں تک پہنچائے جاتے۔

میں نے بھی کن کانٹوں سے اپنا دامن الجھا لیا ہے۔ آیئے اپنے راستہ سے یہ کانٹے ہٹا کر اپنا سفر طے کریں۔ آج پرویز کا نطق اُن کی زبان کے بوسے لے رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک سے پتہ چلتا تھا کہ اس شخص کی نگاہیں زمان و مکان کے پردوں کو چاک کر کے چودہ سو سال پہلے کے مدینہ طیبہ کا بوسہ لے رہی ہیں۔

"قرآن نے مقامِ محمدیؐ اور مقامِ نبوّت کو مختلف مقامات پر مختلف اسالیب میں سمجھایا ہے لیکن سورۃ والنجم کی ابتدائی آیات میں مقامِ محمدیؐ کو اس طرح سمو کر پیش کر دیا ہے جیسے قلعۂ آگرہ کے نگینہ میں پورا تاج محل جگمگاتا نظر آجائے ۔۔۔۔ اور پھر سورۃ والنجم کی تفسیر اور مقامِ محمدیؐ کی عظمتوں کا تعارف۔ نبیؐ کی تربیت کے مرحلے، نگاہِ خداوندی کی نگہداشت۔ وحی کا تصور۔ قرآن کی [illegible] رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی اہمیت۔ ہر مسئلہ ایک دوسرے سے یوں پیوستہ ہوتا گیا جیسے موتی سے اس کی آب۔ پیوست ہوتی ہے یا انسان سے تکریم وابستہ ہے۔ چند حضرات کے نزدیک رسولؐ محض قاصد ہوتا ہے (نعوذ باللہ) یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ خدا کی وحی تو اہلِ دانش کو پہاڑوں پر بھی نظر آجاتی ہے لیکن انسانوں کو انسانی نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وحی الٰہی کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ محمدؐ عربی نے قرآنی احکام کو ایک معاشرہ کی صورت میں متشکل کر دیا اور مقامِ عبدیت و رفاقت کی معراج پر پہنچ گئے ہیں

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشود آں ز کمانِ محمدؐ است

آج کے درس کے دوران لاؤڈ اسپیکر پرویز کے جذبۂ دروں کا ساتھ نہ دے سکا۔ اِدھر لاؤڈ اسپیکر خراب ہوا اور اُدھر مجمع ہزار آدمیوں تک پہنچ گیا تھا۔ پرویز صاحب مجمع کے درمیان آ گئے اور تقریر کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ اُن کی آواز اور بلند ہو گئی اور کچھ لوگوں کے کانوں نے ساتھ دیا اور جذب و سرور کے ستارے چمکتے رہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جنھیں اپنے سامعین کی ایسی رفاقت حاصل ہو سکے اس رفاقت کی بنیاد ہی قرآن ہے۔ اور پھر ذکر بھی تو اُس ذاتِ اقدس کا تھا جو آج بھی ملت کی زندگی اور وحدت کا زندہ اشارہ اور علامت ہے۔

آج کے مجمع میں صدر صاحب (خان بخت جمال) کی کیفیت نہ پوچھیے۔ آنکھوں کے آنسو اُن کی نورانی داڑھی کی فضاؤں میں عشق کے دیے جلا رہے تھے اور ان کی نگاہیں جیسے پرویز کی آواز کے شعلہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو شخص آواز کو یوں دیکھ سکے اس کے جذبہ عشق کا حریف کون ہو سکتا ہے۔ پہاڑوں کا یہ بیٹا اپنے سینے کے کوہساروں کے اندر کیسا پاکیزہ دل رکھتا ہے!

۳۱ اگست آج شام پانچ بجے سندھ مسلم لا کالج میں "انسان اور کائنات" کے موضوع پر تقریر تھی۔ یہ تقریر خاص طور پر اساتذہ اور طلباء کے لئے تھی۔ نئے ذہن کائنات کے کتنے ہی مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ یہ راکٹ اور مصنوعی سیاروں کا دور ہے۔ روسیوں نے چاند پر اپنا پرچم نصب کر کے عظمتِ آدم کے نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ہ کی عملی تفسیر ہے۔

شام کے سوا سات بجے، میں، پرویز صاحب کے ساتھ قافلۂ بہار کا ایک فرد بن کر سندھ مسلم لا کالج پہنچا۔ اتنے نوجوانوں اور طالب علموں کا مجمع میں نے عرصہ سے کراچی میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ مجمع کاہے کو تھا یہ تو ایک قافلہ تھا ذہنِ جدید کا جو نئی کائناتی حقیقتوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ یہ وہ نوجوان تھے جو "گنبدِ آبگینۂ رنگ" کو اپنے محیط کا حباب بنانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اقبال کے یہ اشعار رقصاں و غزل خواں پرویز کی زبان سے ادا ہوئے۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق، میری نظر بخش دے

سوزِ جگر، عشق، نظر ... اور اسی کے ساتھ ساتھ دیدۂ تر کی بے خوابیاں، نالۂ نیم شب کا نیاز اور خلوت و انجمن کا گداز ...

آج کے جلسہ کی صدارت جناب اے۔ کے بروہی کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ پرویز صاحب کی فکر نے ہمارے لئے قرآن کے کتنے ہی گوشوں کو منور کیا ہے۔ اور میں نے جب بھی کسی مسئلہ پر اُن سے تبادلہ خیالات کیا اُن کے افکار کو بہت واضح اور یقینی پایا۔ مختصر سی تعارفی تقریر کے بعد پرویز صاحب نے پہلے تو نوجوانوں کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ جس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں اور اُس کے بعد انھوں نے اپنے موضوع کو تاریخ کی روشنی میں پیش کیا۔

"قوموں کے عروج و زوال میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ خارجی کائنات اور OUT ER SPACE کے بارے میں ان کا نظریہ کیا ہے؟ انسان کے شعور نے جب پہلے پہل آنکھ کھولی تو فضا اور ماحول اس کے خلاف تھا۔ سر پر آگ برسانے والا شعلہ۔ آندھیاں جھکڑ

بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، بپھرے ہوئے دریا اور اُن کے درمیان نہتا اور تنہا انسان۔ نہتا یوں کہ فکر و دانش میں پختگی پیدا نہ ہوئی تھی وہ فطرت کی طاقتوں کے سامنے جھکنے لگا۔ انسان کا یہ ابتدائی مذہب (خود ساختہ) خوف کا پیدا کردہ تھا۔ اس وقت انسان حوادث کے اسباب و علل سے بھی واقف نہ تھا۔ فطرت کے مظاہر ہر جگہ خدا کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔"

ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ کی اس تقریر میں پرویز صاحب نے صرف کائنات اور انسان کے باہمی رشتہ کے بارے میں قرآن کے نقطۂ نظر ہی کو پیش نہیں کیا بلکہ تاریخ کے آئینہ میں انسان کے اہم نقاط نظر کو پیش کر دیا تاکہ انسانی فکر کی نارسائی اور وحیٔ خداوندی کی رسائی کے تقابل میں آسانی ہو۔ اتنے کم وقت میں ایسے عالمانہ اور دقیق مسئلہ کو پرویز صاحب نے آج کی علمی زبان میں جس طرح پیش کیا اس کی وجہ سے یہ تقریریں کے دورۂ کراچی کی تقاریر میں نمایاں حیثیت کی حامل بن گئی۔

ابتدائی دور (ماقبل تاریخ) کے انسان اور اُس کے مذہب کے ذکر کے بعد پرویز صاحب نے یونانی فلسفہ اور اسلام سے پہلے کے دوسرے مذاہب کا نقطہ نظر کائنات کے بارے میں پیش کیا۔

"سقراط نے کہا کہ خارجی کائنات مطالعہ کے لائق نہیں۔ مطالعہ کے قابل صرف انسانی ذات ہے۔ یہاں تک علمیت تھا۔ اس مرحلہ پر افلاطون آیا اور اس نے تو انداز فکر ہی بدل دیا۔ کہا کہ حقیقی دنیا عالم امثال اور یہ دنیا محض اُس کا عکس ہے۔ اس کا کوئی وجود نہیں۔ افلاطون کے نظریہ نے ادراک بالحواس (SENSE PERCEPTION) کی قدر و قیمت ختم کر دی۔ افلاطون کی یہ فکر دنیائے مذاہب پر چھا گئی اور یہی فکر ہندوستان میں آکر ویدانت بن گئی۔ ہر چیز مایا ہے۔ یہ سنسار پرماتما کی رچائی ہوئی ایک لیلا ہے اور پرماتما نٹ راجن ہے۔ یہی تصور ایران کی مجوسیت اور عیسائی خانقاہوں میں بھی جاری و ساری تھا۔

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ ہر ٹکڑے میں انسانی فکر کی کتنی صدیاں آباد ہیں۔ ملک بدل جاتے ہیں۔ مذہب بدل جاتے ہیں۔ لیکن پرویز صاحب ان سب کو اپنے سننے والوں کے لئے ہم رشتہ بنانا جانتے ہیں۔ اور اب وہ منزل آگئی ہے جب قرآن نے خارجی کائنات کے بارے میں انسانوں کو نیا تصور اور نظریہ عطا کیا۔

"اس پس منظر میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ قرآن کو دو محاذوں پر جنگ لڑنی پڑی۔ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب کے خلاف اور فلسفہ و فکر کے خلاف ۔۔۔ "قصۂ آدم" کے پیرایہ میں قرآن نے انسان اور خارجی کائنات کے رشتہ کو بڑے حسن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ آدم کے سامنے تمام ملائکہ جھک گئے۔ یہ فرشتے فطرت کی قوتیں ہی تو تھیں۔ بڑے بڑے دریا۔ چاند سورج، زمین، آسمان۔ یہ سب انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ قرآن کے اس پیغام نے ایک طرف کائنات کا نقشہ بدل دیا اور دوسری طرف مقام آدمیت کو بدل دیا۔"

اور پھر پرویز صاحب نے حواس کے علم کی اہمیت اُجاگر کی۔ قرآن کی رُو سے بتایا کہ علماء کسے کہتے ہیں؟ طبیعیات اور علم الارض (جیالوجی) کے جو طالب علم اس جلسہ میں موجود تھے۔ اُن کی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی۔ آج انھیں معلوم ہوا کہ وہ قرآنی نقطۂ نظر سے آگے چل کر طبقۂ علماء میں شامل ہوں گے۔ تقریر ختم ہوئی اور تالیوں کی گونج سے دل گرما گئے۔ کیونکہ ان تالیوں کے پیچھے ان نوجوانوں کے

ذہن کا یہ اعتراف تھا کہ ہم قرآن کے نقطۂ نظر کی عظمت کے قائل ہو گئے۔

پرویز صاحب کی تقریر کے بعد بروہی صاحب شکریہ ادا کرنے کھڑے ہوئے اور مزے کی بات یہ کہ شکریہ ادا کرتے کرتے آدھے گھنٹے کی تقریر کر گئے۔

یہ جلسہ ایسا تھا جس کی یاد مجھے یقین ہے کہ بہت دنوں تک خود پرویز صاحب کے دل میں بھی رہے گی۔ وہ آدمی جس نے تنہا اپنا سفر آج سے پچیس سال پہلے شروع کیا ہو وہ اتنے رفیقوں کو دیکھ کر بھلا خوش کیوں نہ ہو۔

اچھا اب اس سفر کی اگلی منزل تک آپ مجھے اجازت دیجئے۔ ۲ ستمبر ۱۹۵۹ء کا جلسہ خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ اور مجھے اس جلسہ میں ظاہر ہے کہ بار حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ لیجئے ام عاکف سے اس جلسہ کی روئیداد سنئے۔ اس کے بعد میں آپ سے اگلے پڑاؤ پر ملوں گا (ام عاکف، پرویز صاحب کے خطوط کی "طاہرہ بیٹی" ہی تو ہیں)۔

۲ ستمبر (ام عاکف کے قلم سے)

علامہ اقبالؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں مسلمان نہ ہوتا یا قرآن کو کتاب اللہ نہ مانتا تو اس کے مطالعہ سے اسی نتیجہ پر پہنچتا کہ یہ کسی عورت کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ لیکن میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ بہشتی زیور کا دور تھا۔ بات نہ کرو۔ آنکھیں نہ اٹھاؤ۔ افسانہ نہ پڑھو۔ غزل نہ پڑھو۔ مرد عورتوں پر حاکم مقرر کئے گئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس "تعزیراتِ اسلام مُلّا" کی ہر دفعہ سے آزاد رہی۔ لیکن جب بھی اپنی دوسری بہنوں کی حالت دیکھتی تو سوچنے لگتی کہ آخر اللہ میاں نے ہم سب کو عورت کیوں بنایا ہے۔ عین اُس منزل پر مجھے طلوع اسلام اور خاص طور پر طاہرہ کے نام خطوط، کے ذریعہ اللہ کے انعامات کا علم ہوا جن سے اُس نے عورت کو نوازا ہے اور اُس کے بعد سے اب تک اپنی بہنوں کے درمیان اس پیغام کو عام کرنے کی سعادت میرے حصہ میں بڑی حد تک آگئی ہے۔

جب پرویز صاحب کراچی میں تھے تو خواتین کی تعداد ہفتہ وار درسوں میں پندرہ بیس سے آگے نہ بڑھی۔ آج شام میں یہی سوچ رہی تھی کہ دیکھیں جلسہ میں کتنی عورتیں آتی ہیں؟ کراچی کی عورتوں کے مسائل اور دشواریوں سے میں بخوبی واقف ہوں۔ انھیں خیالات میں الجھی ہوئی میں پانچ بجے گل رعنا کلب پہنچی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہال میں کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ ہال کا پچھلا کمرہ، اوپر کی گیلریاں سب پُر تھیں۔ ان خواتین میں اسکول کی بچیاں بھی تھیں۔ کالج کی طالبات اور پروفیسر بھی۔ اپوا کی کارکن بھی۔ نانیاں اور دادیاں بھی۔

پرویز صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اسلام کے معاشرتی نظام میں عورت کے بلند مقام سے ہمیں روشناس کرایا۔ انھوں نے بتایا کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ کا مطلب یہ ہے کہ مرد معاشی طور پر عورتوں کے اور اپنے گھرانوں کے کفیل ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں شرفِ انسانیت میں اُن سے کم تر یا اُن کی لونڈیاں ہیں۔ ہر عظمت اور عزت مرد کی طرح عورت بھی حاصل کرتی ہے۔ ان کا دائرہ عمل مختلف ہے اور اپنے دائرہ میں وہ ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اسلامی معاشرہ کی تشکیل عورت کے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ خاندان معاشرہ کی بنیاد کا پتھر ہے۔ اور اس بنیادی پتھر کو مرد

عورت دونوں مل کر نصب کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی کے ہر مرحلہ میں عورت کے فرائض اور درجہ کی نشان دہی پرویز صاحب نے کی۔ اس جلسہ میں مجھے "باباجی" (ہم بچیاں پرویز صاحب کو باباجی کہتی ہیں) کی حکمتِ بالغہ کا نمایاں طور پر احساس ہوا۔ عام طور پر ان کا اندازیہ ہوتا ہے کہ تقریر ڈیڑھ دو گھنٹہ کی اور پھر سوالات کا وقت پندرہ بیس منٹ کا۔ لیکن اس اجتماع میں انھوں نے تقریر زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ کی ہو گی اور باقی سارا وقت سوالات کے لئے وقف کر دیا۔ خواتین کی نفسیاتی کیفیت کا یہ کس قدر صحیح مطالعہ اور ان کے ذوقِ تجسس و کاوش کی یہ کتنی بڑی رعایت تھی! چنانچہ تقریر ختم ہوتے ہی سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ہر طبقہ کی عورتیں یہاں جمع تھیں۔ اُن کے مسائل مختلف تھے، اُن کی الجھنیں مختلف تھیں۔ لیکن ایک بات مشترک تھی یعنی اپنے درجۂ انسانیت کے بارے میں شک و شبہ اور احساسِ مظلومیت۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یتیم پوتے کو میراث میں حصہ ملے گا یا نہیں؟" "کیوٹکس (ناخنوں کی سرخی) لگا کر وضو جائز ہے یا نہیں؟ نماز ہو گی یا نہیں؟" "مرد جہ پردے کے بارے میں کیا رائے ہے آپ کی؟" ("میری رائے کیا ہو گی۔ میں تو قرآن کے احکام پیش کرتا ہوں۔ یہی میری زندگی کا مقصد ہے") کیا عورتوں کی تعداد جہنم میں مردوں سے زیادہ ہو گی؟" سوالات کی نوعیت دوسرے مقرر کے لئے بڑی پریشان کن ہو جاتی لیکن پرویز صاحب کی نگاہ بھانپ رہی تھی کہ ان سوالات کے پیچھے کتنی بے چینیاں اور دکھ بھرے جذبات پنہاں ہیں۔ ان کے جوابات ان دُکھے ہوئے دلوں پر مرہم کا کام دے رہے تھے۔

آج کتنی ہی عورتوں کے ذہن میں قرآنی تعلیمات کی پہلی کرن نے جگہ پائی۔ جلسہ کے بعد ایک بہن اپنی ساتھی خواتین سے کہہ رہی تھیں۔ "جب کبھی جنرل الکشن ہوں گے۔ ہم پرویز صاحب کو اپنی نمائندگی کے لئے کھڑا کریں گے۔" دوسری نے کہا کہ ہم خواہ مخواہ آئے دن نئے نئے مطالبات پیش کرتی رہتی ہیں۔ ہمیں اب صرف ایک ہی مطالبہ پیش کرنا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ ہمیں وہ حقوق دیدیئے جائیں جو قرآن نے ہمیں دیئے ہیں۔"

کتنا بڑا اعتماد تھا جو قرآن اور اس کے پیش کرنے والے 'پرویز' پر ان دلوں میں پیدا ہو گیا تھا! یہ بہت بڑا انقلاب تھا جو اس ڈیڑھ دو گھنٹہ کی محفل برپا کر گئی۔

جلسہ کے بعد محترم اسد حمید صاحب کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی اور لٹین سے تواضع کی گئی۔

۴ ستمبر عزیزانِ من! اُم عاکف سے آپ نے خواتین کے جلسہ کی روئیداد سن لی۔ میں پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور اب ہم پرویز صاحب کے دورۂ کراچی کے آخری عام خطاب تک آ پہنچے ہیں۔

اب تک آپ نے اس سفر کی جو سرگزشت پڑھی ہے اُس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی نے کس انداز سے موضوعات اور سامعین کے مطابق جلسہ گاہوں کا انتخاب کیا تھا۔ چند دوستوں اور رفیقوں نے طے کیا کہ ایک اجتماع میٹروپول ہوٹل میں بھی ہو جس میں اساتذہ، وکیل، سرکاری افسر، صحافی، تاجر اور یونیورسٹی کے طلباء بطورِ خاص شرکت کریں۔ اس اجتماع کے لئے موضوع تھا ــــ "اسلامی آئیڈیالوجی" ــــ ارادہ یہ تھا کہ پانچسو منتخب لوگ اس اجتماع میں مدعو کئے جائیں۔ اور پرویز صاحب

میٹروپول کے ہال میں خطاب کریں لیکن دو تین پہلے سے ہی کتنے ان دیکھے اور اجنبی دوست قرآنی محبت کا تحفہ لے کر آتے اور اس اجتماع کا دعوت نامہ مانگتے (اس اجتماع میں انتظامی سہولتوں کے لئے دعوت نامہ کی شرط تھی)۔ ان کی محبت کو دیکھ کر میاں عبدالخالق، مرزا افضل صاحب، حافظ برکت اللہ صاحب، شفیع صاحب اور انور صاحب اور دیگر احباب کے لئے انکار کرنا مشکل ہو گیا۔ اس سے پہلے کے درس کے موقع پر کتنے ہی رفیق دعوت ناموں کے لئے بے چین تھے۔ یہ اس راہ کے وہ پرانے راہی ہیں جن کے بغیر کسی اجتماع کا تصور ہی ممکن نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ سو سے پندرہ سو تک دعوت نامے تقسیم ہو گئے۔ معاملہ تھا ہوٹل کا، ورنہ میاں عبدالخالق صاحب تو "خانہ بر مہماں گزاشت" پر عمل کر کے روپوش ہو جاتے۔ ہوٹل والوں نے تعاون کیا اور ہال کی جگہ میٹروپول کا وسیع و حسین سبزہ زار (لان) اس اجتماع کے لئے مخصوص کر دیا۔

شام کے پانچ بجے بجتے بجتے میٹروپول کے لان کا سبزہ فرستہ ہزار بارہ سو آدمیوں کے قدموں تلے جاگ اٹھا۔ ہوٹل کی دوسری اور تیسری منزل سے ملک ملک کے سیاح حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے کہ اتنے لوگ کیوں اور کس لئے جمع ہوئے ہیں۔ "سیروفی الارض" کے یہ علم بردار اور عملی ترجمان جو اللہ کی دنیا کو دیکھنے کے لئے اپنے گھروں سے نکلے ہیں ان کے لئے چند سیٹیاں کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ بھی اس مجمع میں آشامل ہوئے۔ زبان اجنبی، لوگ اجنبی لیکن تفہیم کی یہ کوشش ان کی زندگی کی دلیل تھی۔

جلسہ کی صدارت جناب این ایم خاں کر رہے تھے۔ اپنی تعارفی تقریر میں انھوں نے پرویز صاحب کی جدوجہد اور ذہنی و فکری تحریک کو سراہتے ہوئے کہا کہ حقیقی اصولوں کے بغیر ہمارا قومی جسد بے روح تھا۔ اسلامی تصورات ہی اس جسم کے لئے روح کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں ان کو سمجھنے کے لئے اپنے ذہن اور دل کے دروازے کھول دینے چاہئیں۔

حقیقت نری مجرد چیز نہیں۔ حقیقت ہیں نگاہ وہی ہے جو بدلتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی انسانی زندگی میں حقیقتوں کا ادراک کر سکے اور انھیں دوسروں کو دکھا بھی سکے۔ "اسلامی آئیڈیالوجی" پر پرویز صاحب کا یہ خطاب ان کی حقیقت بینی کی شہادت تھا۔ انھوں نے اسلامی آئیڈیالوجی اور ہمارے مروجہ دستور کے درمیان ایک "رشتہ" اور ایک "بیگانگی" کو بڑے تخلیقی انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ساری جنگ اسی بات پر ہوتی رہی کہ قومیت کا تعلق وطن سے ہے یا آئیڈیالوجی سے اور اسی لئے اسلامی آئیڈیالوجی کی تشریح کا موقعہ ہی نہ آیا۔ پاکستان بننے کے بعد اس سوال کا جواب ہمارے قومی وجود کے لئے ضروری تھا اور یہ کام مجلس آئین ساز کے سپرد کیا گیا کہ وہ اسلامی آئیڈیالوجی کی تشریح کرے اور اس کی بنیاد پر آئین بنائے لیکن اس مجلس نے جو دستور بنایا۔ اس میں اس آئیڈیالوجی کی کوئی وضاحت نہ تھی۔ ہمارا مرحوم دستور بے بنیاد تھا اور یہی اس کی ناکامی کی وجہ ہے۔ ہماری مجلس آئین ساز کی لگے دو اس اندھے کی کوشش کی طرح تھی جو اندھیرے کمرے میں اس کالی بلی کو تلاش کر رہا تھا جو اس کمرے میں تھی ہی نہیں۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے اکتوبر ۱۹۵۸ء کی بعد کی قومی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے سامعین کو بتایا کہ

ہم پھر وہیں پہونچ گئے۔ جہاں ۱۹۴۷ء میں تھے اور اس طرح ہمیں اپنے سفر کو دوبارہ اپنی منزل کی طرف جاری رکھنے کا موقع مل گیا۔

اسلامی آئیڈیالوجی کی تشریح سے پہلے پرویز صاحب نے انسانی زندگی کے بارے میں قرآن حکیم کا تصور پیش کیا۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ آئیڈیالوجی کی بنیاد ہی تصورِ حیات ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے کہا کہ "قرآن کی رُو سے انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات یا "انا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن اسے روحِ خداوندی کہتا ہے۔ انسانی ذات مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کی مناسب نشوونما کے ذریعہ ہی انسان حیاتِ جاوداں اور آنے والی زندگی میں بلند تر مدارج حاصل کر سکتا ہے۔ یہ نشوونما غیر متبدل اور مستقل اقدار کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ قرآن نے ہمیں جو مستقل اقدار عطا کی ہیں۔ اُن کے مجموعہ کا نام اسلامی آئیڈیالوجی ہے۔ آئیڈیالوجی کو محسوس شکل اختیار کرنے کے لئے معاشرہ کی ضرورت پڑتی ہے اور حضور نبی اکرمؐ کے دورِ سعید میں اسلامی آئیڈیالوجی نے اسلامی معاشرہ اور ریاست کی شکل اختیار کر لی تھی۔"

سننے والوں کی نگاہوں میں وہی چمک تھی جو کبھی امریکہ کا ساحل دیکھ کر کولمبس کی آنکھوں میں پیدا ہوئی ہوگی۔ پرویز صاحب جہانِ نو کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اپنی تقریر کی اس منزل پر پہنچ کر انھوں نے اسلامی آئیڈیالوجی کے اجزائے ترکیبی یا قرآنی اقدار کو پیش کیا۔ جن اقدار پر انھوں نے زور دیا وہ یہ ہیں۔

۱۔ قرآن کی رُو سے پہلی مستقل قدر یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ انسان کی یہ تکریم اُس کی ذات (روح) کی بنا پر ہے۔ ہر فرد کی عزتِ نفس کا تحفظ اسلامی مملکت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اور اس میں رنگ، نسل، مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں۔

(۲) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہو سکتا۔

(۳) اس بلند تر مقصد (نظامِ خداوندی) کی خاطر معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ یہ تعاون بھی ایک مستقل قدر ہے۔

(۴) یہ باہمی تعاون کسی دوسرے خطۂ زمین میں بسنے والے انسانوں کو اپنا آلۂ کار بنانے یا اُن پر ظلم کرنے کے لئے نہیں ہو سکتا۔ اسلامی معاشرے کے ہر فرد کی زندگی کا مقصد نوعِ انسانی کی بہبود و منفعت ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔ "ما ینفع الناس فیمکث فی الارض"۔

قریب ڈیڑھ گھنٹے تک پرویز صاحب اسلامی آئیڈیالوجی، اسلامی مملکت، اسلامی آئین کے خط و خال کو سحر آفریں انداز میں بیان کرتے گئے۔ سامعین یوں محسوس کرتے تھے گویا قرآنی معاشرہ کا حسین و جمیل تاج محل ان کی آنکھوں کے سامنے ابھرتا چلا آرہا ہے۔ تقریر ختم ہونے پر صدر محترم نے نہایت موزوں الفاظ میں مقرر کا شکریہ ادا کیا۔ جلسہ رسمی طور پر ختم ہو گیا لیکن سامعین کی یہ حالت کہ کوئی اپنی جگہ سے نہیں سرکتا۔ انھیں انتظار تھا کہ اس بلائے حقائق کی تلچھٹ سے بھی ان کے حصہ میں کچھ اور آئے گا۔ چنانچہ ایسا

ہی ہوا اور مزید استفسارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تا نکہ مغرب کی اذان نے توجہات کو دوسری طرف مبذول کر دیا۔
منتظمین نے خنک مشروبات کا انتظام کر رکھا تھا۔ ادھر ادھر میزوں پر ایریٹیڈ واٹر کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوتلیں سلیقے سے رکھی تھیں لیکن تقریر کی زمزم باریوں نے اس قدر سیرابی کا سامان بہم پہنچایا کہ کسی نے ایک جرعہ کی بھی فرمائش نہ کی۔ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ

تیری چشم مست کے سامنے مے ناب یونہی دھری رہی
نہ کسی نے پی نہ کسی نے دی جو بھری تھی خم میں بھری رہی

پرویز صاحب کی اس تقریر نے کراچی کی ساری فضا کو مسحور کر دیا۔ اب شہر میں اس کے سوا کوئی چرچا ہی نہ تھا۔ کراچی والوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اثر و جذب کی یہ کیفیت اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے۔

بجلیاں عام اجتماعات اور درس قرآن کی روداد آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ لیکن ایک اہم درمیانی کڑی کو میں نے دانستہ اب تک پیش نہیں کیا۔ یہ تھا اراکین بزم طلوع اسلام سے پرویز صاحب کا خطاب۔ شفیع صاحب کے مکان پر۔ اس خطاب کی نوعیت دوسرے جلسوں اور اجتماعات کی تقریروں سے مختلف تھی۔ یہاں دل کے اُن داغوں کی نمائش تھی جن پر لوگوں کو "خورشیدِ جہاں تاب" کا دھوکہ ہو۔ یہاں آواز میں آنسوؤں کی تھرتھری تھی۔ دل کی زبان میں دل کی باتیں تھیں یہاں پرویز صاحب بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کی "بالغانہ" سرگرمیوں پر ان الفاظ میں تبصرہ کر سکتے تھے ؎

"بدلے کچھ ایسے طور سے بے طور ہو گئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے"

یہاں دوستوں اور عزیزوں کی خدمات پر محبت کے پھول نچھاور کئے گئے تھے۔ اِن ذاتی تاثرات سے قطع نظر پرویز صاحب نے بہت سی ایسی باتیں بھی کہیں جن پر آپ کا حق اُتنا ہی ہے۔ جتنا اراکین بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کا.... اسی لئے میں اب بیچ میں حائل نہیں رہنا چاہتا اور اُن باتوں کو مختصراً پیش کرتا ہوں۔

"اگر مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ میرے جانے کے بعد آپ اس قدر سرگرمیاں دکھائیں گے تو یقیناً میں چار پانچ سال پہلے ہی یہاں سے چلا جاتا۔ وہ ننھا سا بیج جو بویا گیا تھا اب ایک سایہ دار درخت ہے۔ یہ نیپیر بیرکس گیا تھا خاص طور پر وہ نیم کا درخت دیکھنے جس کے نیچے ایک مقرر ہوتا تھا اور دو سننے والے یعنی ڈاکٹر سعید مرحوم، اور رفیق عزیز سبحانی مرحوم۔ وہ دونوں یقیناً اُس دنیا میں ہماری سرگرمیوں کا محاسبہ کر رہے ہوں گے۔ مدتوں ہم تین سے چار نہ ہونے پائے۔ پھر اُس ننھے سے بیج سے کونپلیں پھوٹیں جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور شاخیں فضا میں پھیل گئیں۔

"ساتھیو! ہمارا مقصد اُس نظام کا احیاء ہے جس کی تشکیل چودہ سو سال پہلے قرآن کی روشنی میں نبی اکرم صلعم نے فرمائی

تھی۔ مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے کہ لاہور اور گردونواح کے علاقے اس تحریک قرآنی کے لئے بہت سازگار ثابت ہوئے۔

"میں کچھ باتیں اس تحریک اشاعتِ فکرِ قرآنی کی رفاقت کے سلسلہ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ کوئی دو ایسے فرد نہیں ملیں گے جن کی شکلیں اور مزاج بالکل ایک ہوں۔ توام اور جڑواں بچوں میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے۔ آپ مزاج کے فرق کو کام کا فرق نہ سمجھ لیجئے گا۔ ورنہ اس سے اجتماعی کوشش (TEAM WARK) ختم ہو جائے گا۔ آپ نے اپنے لئے ایک اچھے کپتان (میاں عبدالخالق) کا انتخاب کیا ہے۔ اُس کی ہدایات پر عمل کرنے سے کامیابی قریب تر آجائے گی۔ لیکن ہدایات کو حکم نہ سمجھئے گا کیونکہ قرآن کی رُو سے کوئی شخص دوسرے کا محکوم نہیں ہو سکتا۔

"اس جذبۂ اجتماعی کو اس وقت برقرار رکھنے کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ ہم تاریخ کے ایک بڑے ہی عجیب اور نازک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے ایک بڑی ذمہ داری کو قبول کیا ہے۔ آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم قرآنی نظام کے بغیر مسلمان کی مکمل زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ آج کی دنیا کا رنگ یہ ہے کہ صدیوں کی راہ دنوں میں طے ہو جائے۔ کراچی والوں کی ذمہ داری تو اور بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ پاکستان میں یہ تحریکِ نظامِ ربوبیت و فکرِ قرآنی یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ یہ مرکزی مقام ہے اور یہاں کے اثرات سے ہمارا ملک دامن نہیں بچا سکتا۔

"ہمارا یہ دور عہد رفتار ہے۔ حالات بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ شاید قرآنی انقلاب کے لئے زیادہ مدت درکار نہیں۔ اس وقت تھکئے گا نہیں۔ پیروں سے کانٹے نکالنے کے لئے بیٹھ نہ جائیے گا۔ وقت کا سیلِ رواں کانٹا نکالنے والوں کو اپنے ریلے میں بہالے جاتا ہے۔ قرآن کی فکر کو سارے ملک میں عام کر دیجئے۔ یہی آپ کا کام اور مقصد ہے۔ اس کے بعد وقت آئے گا جب اطمینان سے بیٹھ کر پیر سے کانٹے بھی نکالیں گے۔

"اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اس کی کائناتی قوتیں آپ کی رفیق ہوں اور کیا عجب کہ ہم وہ منظر دیکھ کر اس دنیا سے جائیں جس کو دیکھنے کی تمنا لئے ہوئے گذشتہ کئی صدیوں میں کتنی ہی سعید روحیں اس دُنیا سے گزر گئیں۔"

تقریر کا ہے کو تھی، ہمرہوں کے لئے بانگِ درا تھی۔ ہر چہرے پر عزم تھا، ایک نیا عزم۔ کہتے ہیں کہ چہرہ خیالات کا دریچہ ہوتا ہے۔ اور اُس شام اس دریچہ میں حوصلہ اور عزم کی دیوی اپنے جلووں سے نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔

رخصت اے دوست کہ ہنگامِ سفر آہی گیا

۴ ستمبر کو عام تقریروں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ آنے والے اتوار کا درسِ قرآنِ حکیم ابھی باقی تھا۔ لیکن یہ درس بارش کی نذر ہو گیا ویسے اپنے اس قیام میں پرویز صاحب نے ذہن کے لئے بہت کچھ عطا کر دیا تھا۔ اور اب یہ تصورات عمل کے قالب میں ڈھلنے کے لئے بیچین ہیں۔ جو خیال دل کی گہرائیوں میں جگہ پالیتا ہے وہ محسوس شکل میں ڈھلے بغیر نہیں رہتا ــــ یہ نکتہ ہر انقلاب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔

اب پرویز صاحب لاہور جانے کے لئے بے چین تھے۔ ادھورے کام انھیں آواز دے رہے تھے۔ لغاتِ قرآن کی اشاعت انھیں بُلا رہی تھی۔ ادارے کے ساتھی انھیں خاموش اشاروں سے بلا رہے تھے۔ جس کے دل میں کوئی لگن ہو اُس کا وطن تو اس کا کام ہی ہوتا ہے۔ لیکن کراچی والوں کا جذبۂ صادق رنگ لایا اور انھیں ۱۰ ستمبر کی شام سے پہلے ہوائی جہاز میں جگہ نہ مل سکی۔

وقت بھاگتا رہا اور آخر ۱۰ ستمبر کی شام بھی آگئی۔ یہ شامِ جدائی تھی اور چہروں پر اُس کا اثر ہویدا تھا۔ آج شام احباب کو شفیع اور انور صاحبان نے چائے پر بُلایا تھا تاکہ پرویز صاحب سے الوداعی ملاقات ہو سکے۔ بے تکلف احباب کو اگر شکوہ تھا تو یہ کہ انھیں اتنی پُرتکلف چائے کیوں پلائی گئی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سات بج گئے اور گاڑیاں ہوائی اڈے کی طرف بھاگنے لگیں۔ راستہ بھر اور خود ہوائی اڈے پر پرویز صاحب نے قطعاً محسوس نہ ہونے دیا کہ ان کے سینے میں کن بے پناہ جذبات کا طوفان بپا ہے۔ لیکن جب لاہور جانے والے مسافروں کو بلایا گیا اُس وقت ان کی قوتِ ضبط پوری طرح ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ چشمہ کے پیچھے آنکھوں کی نمی، ہونٹوں کی مسکراہٹ کا بھرم کھو رہی تھی۔ وہ ہر ایک سے الگ الگ ملے۔ بالآخر مشترکہ الوداعی سلام کے لئے ہاتھ بلند کیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ ویسے تو سب پر اثر تھا۔ لیکن صدر صاحب الگ کھڑے کا سہارا لئے کھڑے تھے اور آنکھیں خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں؟ کیا ڈھونڈھ رہی تھیں؟ میں نے حسنین سے کہا کہ اس سارے مجمع میں یہ کیفیت اور کس کے حصہ میں آئی ہے؟ آخر سرحد کے اس جیالے بیٹے کو منہ پھیر کر آنکھوں کے آنسو پونچھنے ہی پڑے۔

جہاز رن وے پر بھاگتے بھاگتے فضا میں اڑنے لگا۔ اور پھر متحرک روشنیوں نے ہوائی جہاز کی جگہ لے لی سخر لکم مافی السمٰوٰت ومافی الارض کے قرآنی پیغام سے ہمیں آشنا کرنے والا اب فضا کے دوش پر تھا۔

اے محملِ عصرِ حاضر..... خدا حافظ..... تو اپنے پَروں کے سہارے اتنی محبوب شخصیت کو لئے جا رہا ہے۔ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق تیرا یہ سفر اچھی طرح کٹے ــــ خدا حافظ!!

اور اے قافلۂ بہار کے طائرِ پیش رس! الوداع ــــ

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا!

(ابو عاکف)

قرآنِ کریم کے خلاف بہت بڑی سازش

(پرانی شراب نئی بوتلوں میں)

تفصیل طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے!!

مصر کے عظیم مفکّر اور حقیقت نگار

علّامہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین

کی

مشہور تصنیف

الفتنۃ الکبریٰ

(اُردو میں)

حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اسکے محرکات و پس منظر پر محققانہ تبصرہ

صفحات:- ۵۴۰

قیمت:- چھ روپے

اس پتہ سے منگوائیے:- ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی-گلبرگ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

پاکستان میں

کوئی بھوکا نہ رہے

قرآن کے معاشی نظام کے متعلق محترم پرویز صاحب
کی حقیقت کشا تقریر جو انھوں نے ۲۷ اگست ۵۹ء
کو کراچی میں فرمائی

شائع کردہ

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم کا معاشی نظام

[محترم پرویز صاحب کی تقریر جو انھوں نے ۲۷ اگست ۱۹۵۹ء کی شام، تھیاسوفیکل سوسائٹی ہال۔ کراچی میں، کثیر لیکن نہایت سنجیدہ اور شستہ مجمع کے سامنے فرمائی]

انسانی بچہ جب دنیا کی فضا میں پہلا سانس لیتا ہے تو بھوک سے چلاتا ہے اور اپنے رزق کے سرچشموں کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ اور جب انسان اس دنیا میں آخری سانس لیتا ہے تو بھی اس کے حلق میں کچھ ٹپکایا جاتا ہے تاکہ اسے کچھ نہ کچھ توانائی مل سکے۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ اس کے حصے کا رزق ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا رزق کا معاملہ ایسا ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے کسی سانس میں بھی بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ انسانی زیست کے لئے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جس شخص کو آرام سے بافراط کھانے پینے کو مل جاتا ہے اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی ایک ایک سانس پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اُس نے اُسے روٹی کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونے دیا۔

انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر انسان کی اجتماعی زندگی پر غور کیجئے تو اس میں بھی یہی نظر آئے گا کہ قوموں کی تگ و تاز اور جدوجہد کے لئے سب سے زیادہ جذبۂ محرک رزق کا سوال ہوتا ہے۔ رزق کی یہی اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تاریخ انسانیت کی تعبیر ہی معاشی نقطہ نگاہ سے کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک سابقہ اقوام کی

معاشیات کی اہمیت

تاریخ کا تعلق ہے مارکس کا یہ نظریہ صحیح ہو یا غلط (اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ذرا آگے چل کر کی جائے گی) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے دور میں اس مسئلہ نے ایسی اہمیت اختیار کر رکھی ہے کہ آنے والا مورخ جب اس پر نگاہ ڈالے گا تو وہ اسے عصرِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکار سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تہذیب تمدن، معاشرت، سیاست، قومی مسائل اور بین الاقوامی معاملات، سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت

دنیا عملاً جن دو بلاکس (BLOCKS) میں بٹی ہوئی ہے، ان میں، کہنے کو تو خطِ امتیاز، نظامِ حکومت ہے ـــــ یعنی ڈکٹیٹر شپ اور جمہوریت ـــــ لیکن درحقیقت ان میں بنیادی اختلاف نظامِ معیشت (ECONOMIC ORDERS) ہی کا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام، روٹی کے مسئلہ نے دونوں کی ناک میں نکیل ڈالی ہوئی ہے اور وہ انھیں جدھر جی چاہے کشاں کشاں لئے لئے پھر رہا ہے۔

مذہب اور روٹی

انسان نے اس اہم مسئلہ کے حل کے لئے جب مذہب کے دروازے پر دستک دی ـــــ مذہب سے میری مراد ہے انسانوں کا خود ساختہ مذہب ـــــ تو اس نے یہ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیا کہ ہمارا مقصد، انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس دنیا کے مسائل سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ یہ مادی دنیا، کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ اس لئے خدا کے نیک بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس سے دور بھاگیں ـــــ لیکن یہ محض فریبِ نفس تھا یا فرار کی راہ۔ اس لئے کہ انسان دنیا سے کتنی ہی دور کیوں نہ بھاگے۔ اور اس طرح کتنا ہی بڑا ایشور کا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے لیکن خوراک کے مسئلہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ کھائے۔ کھائے بغیر گذارہ نہیں سکتا۔ بھوک، رشیوں منیوں کو بھی لگتی ہے اور پیروں فقیروں کو بھی۔ کھانے بغیر نہ "ایشور کے اوتار" زندہ رہ سکتے ہیں نہ اللہ کے مقرب۔ اس لئے (انسانوں کے خود ساختہ) "مذہب" کا یہ کہنا کہ اُسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں، حقیقت کو جھٹلانا اور لوگوں کو فریب دینا ہے۔ ایسے مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس لئے دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

اسلام، مذہب نہیں بلکہ الدّین ہے جس کے معنی ہیں نظامِ زندگی یا ضابطۂ حیات۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کا دعویٰ ہو کہ وہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔ اور جو ضابطہ، حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کے لئے راہ نمائی دینے کا مدعی ہو وہ انسان کے معاشی مسئلہ سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے؟ وہ روٹی کے سوال سے کس طرح آنکھیں بند کر سکتا ہے؟ چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ کو پوری پوری اہمیت دی ہے اور اس کا ایسا حل بتایا ہے جو ان پریشانیوں کو نہایت آسانی سے دور کر دیتا ہے۔ جو انسان کو جہنم کی آگ کے شعلے بن کر چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہیں۔

قرآن اور روٹی کا مسئلہ

قرآن کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو، یہ سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو، اس پر خدا کا غضب ہے۔ سورۂ نحل میں ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا (۱۶/۱۱۲) خدا تمہیں ایک مثال دے کر بات سمجھاتا ہے (مثلاً) قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ، ایک بستی تھی جو نہایت امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کے کھانے پینے کا سامان (رزق) ہر جگہ سے بافراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔

فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ۔ اس نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناشکر گذاری کی۔ تو ان کے اس جرم کی پاداش میں فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶/۱۱۲) اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

آپ نے مذہبی حلقوں میں اس قسم کے فقرے سنے ہوں گے کہ انسان کو ہمیشہ احکام خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے جو شخص خدا کی نافرمانی کرے اس پر اس کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھئے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ اس قسم کے انسان کو مرنے کے بعد جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں خدا کے عذاب کا مزا چکھتا ہے۔ مرنے کے بعد جہنم اور جنت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآن کریم قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے (روگردانی کرنے) کا جو عذاب بتاتا ہے وہ اسی دنیا میں سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴) (یاد رکھو) جو کوئی میرے قانون سے روگردانی کرے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ رزق کی تنگی (یعنی بھوک کا عذاب) ہے۔

معیشت کی تنگی

آپ نے بعض لوگوں کو کہتے سنا کہ خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور انہیں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے انہیں کھانے کو روٹی نہیں ملتی۔ پہننے کو کپڑا نہیں ملتا۔ مفلسی، تنگ دستی، بے کسی و بے چارگی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ وہ اس دنیا میں بڑی عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عاقبت اتنی ہی زیادہ تابناک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث بھی رونما ہوتے ہیں جن میں انہیں سخت مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (مثلاً جنگ کے زمانے کی تکالیف اور مصیبتوں سے کون واقف نہیں جن میں بڑی بڑی خوش حال اور دولتمند قومیں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں؟)۔ لیکن یہ صرف ہنگامی حادثات ہوتے ہیں جو آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ لیکن اگر عسرت اور زبوں حالی کسی فرد یا قوم کی زندگی کا معمول ہو جائے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیئے کہ یہ خدا کے مقبول بندوں کی علامتیں ہیں۔ یہ چند روزہ (دنیاوی زندگی) کے مصائب ہیں۔ اس کے بعد (آخرت کی زندگی میں) تمام خوشگواریاں اور سرفرازیاں انہی کے حصے میں آئیں گی۔ اس لئے کہ قرآن نے جہاں کہا ہے کہ مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا۔ (جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائیگی) تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴) "اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی سے اعراض کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں رزق کی تنگی اور آخرت میں ذلت و رسوائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے زندگی ایک جہد مسلسل ہے جو اس دنیا سے اس دنیا تک مسلسل چلی جاتی ہے اس لئے جن اعمال کے نتائج

عاقبت کا اندھا

اس زندگی میں رسوا کن اور ذلت انگیز ہوں، عاقبت میں ان کے نتائج عزت بخش اور مسرت آمیز نہیں ہو سکتے اس باب میں قرآن کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا - (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔

اقبالؔ کے الفاظ میں۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا ۔۔۔ جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا ۔۔۔ جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

ہندا یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی قوم کی عاقبت کی زندگی کیسی ہو گی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کیسی ہے۔ اگر اسے سامانِ زیست کی فراوانی نصیب نہیں۔ اگر وہ رزق کی تنگی کے عذاب میں ماخوذ ہے۔ اگر وہ اپنی روٹی کے لئے بھی دوسروں کے در داز پر جھولی پھیلانے کے لئے مجبور ہے تو اُس قوم کو عاقبت کی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب نہیں ہو سکتیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُو سے جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ قرآن نے انسان کی سرگزشت کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اس میں بتاتا ہے کہ جب آدم جنت میں تھا تو اس سے کہہ دیا گیا تھا کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا

جنت کی زندگی

تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى - وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸) تجھے یہاں یہ میسر ہے کہ تو نہ اس میں نہ بھوکا رہے نہ ننگا۔ نہ پیاسا رہے اور نہ ہی دھوپ میں" یعنی اُس جنت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضرریاتِ زندگی (روٹی۔ پانی۔ لباس۔ مکان) سے محروم نہیں تھا۔ اس میں آدم اور اس کی بیوی سے کہدیا گیا تھا کہ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ تم اس میں سے جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ (پیو)۔ یعنی اس میں ہر ایک کے لئے ہر جگہ، بافراط سامانِ رزق موجود تھا۔ یہ تھی وہ جنت ارضی جو انسان کی مفاد پرستیوں کی وجہ سے اس سے چھن گئی اور جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی اور اس سے کہدیا گیا کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۚ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۲۰/۱۲۳) سو جب تمہارے پاس میری طرف سے راہ نمائی آئے۔ سو جو میری راہ نمائی کا اتباع کرے گا، تو نہ اس کی کوششیں رائگاں جائیں گی اور نہ ہی وہ (سامانِ زندگی سے) محروم رہے گا۔ (اور نہ ہی ان کے حصول کے لئے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی)

فرزندانِ آدم کے لئے، اس زمین پر، اسی جنت کی دوبارہ تشکیل، قرآن کا مقصود دنتہٰی ہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت یا (QURANIC SOCIAL ORDER) کہتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت قائم کس طرح ہوتا ہے

قرآن کا مقصود

اور اس میں انسان کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی رُو سے روٹی کے مسئلہ کا حل مقصود بالذات ہے یا یہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے کہ اسی بنیاد پر انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی پوری پوری عمارت استوار ہوتی ہے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا نہایت ضروری ہے زندگی کا ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے کھا پی کر بڑا ہوتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ تاکہ کھانے پینے کا سامان

حیوانی سطح کی زندگی حاصل کر سکے۔ شادی کرتا ہے۔ صاحب اولاد ہوتا ہے۔ اولاد کو کمانے کے قابل بنا دیتا ہے اور مر جاتا ہے قرآن کہتا ہے کہ اگر زندگی کا مقصد اتنا ہی ہے تو پھر ایک حیوان اور انسان میں کچھ فرق نہیں۔ یہ کچھ ہر حیوان کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ کام کاج کرتا ہے۔ اپنی نسل بڑھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ قرآن اس زندگی کو کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ۔ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲)۔ اور جو لوگ کفر کرتے ہیں، وہ (متاعِ زندگی سے) فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھا پی کر (مر جاتے ہیں) ان کا ٹھکانہ آگ ہے۔" اس کے برعکس، دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد، اس کی ذات کی نشوونما ہے جس سے ایک فرد، اس دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں ارتقائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوعِ انسانی کو بھوک، خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔ اس کا نام انسانی سطح کی زندگی ہے۔

انسانی سطح کی زندگی قرآن کہتا ہے کہ اگر افراد، روٹی کی فکر سے آزاد نہ ہوں تو وہ انسانی سطح کی زندگی تک پہونچ ہی نہیں سکتے اس لئے وہ کہتا ہے کہ ایسا معاشرہ قائم ہونا چاہیئے جو افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں، حیوانی سطح سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ قرآنی نظامِ ربوبیت، افراد کو روٹی کی فکر سے آزاد کر کے انہیں انسانیت کی سطح پر لے آتا ہے۔ اسلامی معاشرہ اُس خدا کی ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتا ہوا، جس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے وہ وجود میں آتا ہے، تمام افرادِ معاشرہ سے پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ

رزق کی ذمہ داری

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

یہ ذمہ داری، صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس مملکت کی حدود میں بسنے والے تمام ذی حیات کو محیط ہوتی ہے اس لئے کہ جس خدا کے نام پر یہ مملکت قائم ہوتی ہے اس کا اعلان ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) "روئے زمین پر بسنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔" اللہ کی یہ ذمہ داری اسلامی مملکت کے ہاتھوں کس طرح پوری ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے فرمایئے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمر سے اس کی باز پرس ہو گی۔

اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ مملکت (بلکہ اس حدود میں بسنے والے تمام جانوروں تک) کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لیتی وہ اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مملکت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا کس طرح سے کر سکتی ہے؟ قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس مملکت نے خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے سر پر لیا ہے۔ رزق کے سرچشمے اور وسائل پیداوار جو خدا کی ملک ہیں، اس مملکت کی تحویل میں چلے جائیں گے تاکہ وہ ان کا ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی پرورش ہوتی چلی جائے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی

رزق کے سرچشمے مملکت کی تحویل میں

نظام ربوبیت میں، رزق کے سرچشموں پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ نہ افراد کی اور نہ مملکت کی۔ مملکت بھی صرف ان کا انتظام کرتی ہے۔ رزق کے سرچشموں میں بنیادی حیثیت ارض (زمین) کو حاصل ہے جس سے نہ صرف اناج پیدا ہوتا ہے بلکہ تمام مصنوعات کے لئے خام مسالہ بھی وہیں سے برآمد ہوتا ہے۔ ارض کے لئے قرآن نے کہہ دیا ہے کہ اسے خدا نے مخلوق کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)۔ اس لئے اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کا پیدا کردہ رزق تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے سَوَاءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰)۔ اس لئے کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (۵۶/۷۳) ہے۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی۔ اسے اسی مصرف میں لانا چاہیئے اگر یہ افراد کی ملکیت میں چلی جائے تو اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسے معاشرہ کی اجتماعی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے، سورۃ الواقعہ میں بڑے دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا جسے تم بوتے ہو؟ تم اتنا ہی کرتے ہو کہ زمین میں ہل چلاتے ہو۔ اسے کاشت کے قابل بناتے ہو۔ پھر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد سوچو کہ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ کیا اس بیج میں سے پودا تم پیدا کرتے ہو یا ہمارا قانون پیدا کرتا ہے؟ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ۔ اگر ہمارا قانون اس کے خلاف چاہتا تو ہم اس کھیتی کو خشک سالی سے چورا چورا کر دیتے اور تم حیرت میں گم ہو جاتے کہ یہ کیا ہو گیا؟ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ فصل تو ایک طرف ہم بیج سے بھی محروم ہو گئے۔

پھر آگے بڑھو اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا جو تمہارے لئے زندگی کا سامان اور تمہاری کھیتی کے اُگنے کا ذریعہ بنتا ہے؟ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ کیا اسے بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ۔ اگر ہمارا قانون دوسری طرح چاہتا تو ہم اسے (ایسا) کھاری بنا دیتے جسے نہ تم پی سکتے نہ اس سے تمہاری کھیتیاں اُگ سکتیں۔ سو تم اس کے قدر دان کیوں نہیں ہوتے؟

اور آگے بڑھو۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ کیا تم نے اس آگ پر بھی غور کیا جسے تم جلاتے ہو۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ۔ کیا اس درخت کو جس سے آگ کا سامان ملتا ہے تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں)

ذرا سوچو کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس میں تمہارے لئے عبرت و موعظمت کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں (نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً)۔ اس سے سبق حاصل کرو۔ یہ سبق کہ یہ سب کچھ تمہارا پیدا کردہ نہیں۔ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ تم اس میں صرف

محنت کرتے ہو۔ اس لئے اس کھیتی میں تمہارا حصہ تمہاری محنت کے بقدر ہے۔ باقی سب کچھ ہمارا ہے۔ اسے ہم مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ (۵۶/۷۳) بھوکوں کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے۔ اس لئے اس فالتو رزق کو ان کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو۔ سارے کا سارا اپنی ملکیت نہ سمجھ لو۔ اقبال کے الفاظ میں غور کرو کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار — خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں۔ تیری نہیں، میری نہیں (بالِ جبریل)

جو کچھ قرآن نے یہاں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے۔ وہی کچھ دوسرے مقامات پر عام دولت کے متعلق بھی کہا ہے۔ قارون کو قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قارون کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ کہتا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸) میری تمام دولت میری اپنی ہنرمندی کی وجہ سے مجھے ملی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹/۴۹) یہ ذہنیت بڑی غلط نگہی اور گمراہی پر مبنی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ جو کچھ انسان کماتا ہے وہ اس کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس میں کتنے ایسے بھی عناصر شامل ہوتے ہیں جن میں انفرادی طور پر اسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً اس کی پیدائشی صلاحیتیں۔ تعلیم و تربیت۔ ماحول کے اثرات۔ معاشرہ کا نظم و نسق۔ مناسب مواقع (APPORTUNITIES) کا ملنا وغیرہ

فرد اور مملکت کا معاہدہ

یہ تو رہا اس مسئلہ کا اصولی پہلو۔ جہاں تک اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے۔ قرآن اسے نہایت عمدگی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب افراد کی تمام ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان و ذرائع کی فراہمی کی ذمہ داری مملکت اپنے سر لے لے، تو دولت کا افراد کی ملکیت میں رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں افراد اور مملکت میں ایک معاہدہ ہوتا ہے جسے قرآن نے نہایت مختصر لیکن جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱) افرادِ معاشرہ اپنی جان اور مال اللہ (یعنی اس مملکت) کے سپرد کر دیتے ہیں (جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے) اور مملکت انہیں الجنۃ کی ضمانت دے دیتی ہے۔ الجنۃ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک اس دنیا میں جنتی زندگی کا تعلق ہے، اس میں تمام سامانِ زیست اور ضروریاتِ زندگی با فراغت ملتی چلی جاتی ہیں۔ افراد اور مملکت کا یہ معاہدہ یونہی ذہنی طور پر نہیں ہوتا بلکہ اس سوسائٹی کا ممبر وہی بن سکتا ہے (بالفاظِ دیگر مسلمان وہی ہو سکتا ہے) جو برضا و رغبت بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے اس معاہدہ پر دستخط کرے۔ اس معاہدہ کی رو سے، ہر فرد اپنے محنت کے ماحصل سے اپنے پاس صرف اتنا رکھ سکتا ہے جتنے میں اس کی ضروریات پوری

ہو جائیں۔ باقی سب نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا رکھتا ہے۔ اور مملکت کے فیصلے کے مطابق صرف کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ اس طرح قرآن فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہنے دیتا۔ اور نظام سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی فاضلہ دولت پر ہے۔

اس مقام پر وہ سوال سامنے آتا ہے جس کا (بظاہر) کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا اور جسے نظام سرمایہ داری (CAPITALISTC SYSTEM) کی تائید میں بطور دلیل محکم پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وہ بھنور ہے جس میں روس کے معاشی نظام کی کشتی بری طرح پھنس رہی ہے اور اسے اس میں سے نکالنے کی کوئی تدبیر وہاں کے ارباب حل وعقد کے ذہن میں نہیں آتی۔

جذبۂ محرکہ

سوال یہ ہے کہ جب افرادِ معاشرہ کو یقین ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں ان کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں گی۔ انہیں اس کا بھی پتہ نہ ہو کہ وہ کتنا ہی کام کیوں نہ کریں، ان کی ضروریات سے زائد دولت ان کے پاس رہ نہیں سکتی، تو اول تو وہ کام ہی کیوں کریں۔ اور اگر ان سے کسی طرح کام لیا بھی جائے تو وہ پوری محنت سے کام کیوں کریں؟ جس دولت کے متعلق وہ جانتے ہوں کہ ان کے پاس نہیں رہ سکتی، وہ اس کے حصول کے لئے جان کیوں کھپائیں؟ لہٰذا اس قسم کے نظام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ محنت سے جی چرائیں گے اور ملک کی پیداوار اور قومی دولت روز بروز کم ہوتی جائے گی۔ روس اس وقت اسی مصیبت میں مبتلا ہے۔ کمیونزم نے غریبوں اور مزدوروں کو یہ کہہ کر انقلاب کے لئے ابھارا کہ تم اٹھو اور دولت مندوں سے ان کی دولت چھین لو۔ لیکن اب یہ مرحلہ گذر گیا اور جن دولت مندوں کے خلاف عوام کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکائی گئی تھی وہ باقی نہ رہے تو عوام کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب وہاں کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں ملتا جو عوام کو جائز و شائستہ طور پر محنت پر آمادہ کر سکے۔ کمیونزم کی یہی بیماری لاعلاج ہے جس کی وجہ سے نظام سرمایہ داری کے حامل یہ کہتے ہیں کہ جب تک افراد کو اس کا یقین نہ ہو کہ وہ جو کچھ کمائینگے ان کی ملکیت رہے گا، وہ کبھی پوری محنت سے کام نہیں کریں گے۔ لہٰذا نظام سرمایہ داری ہی قابلِ عمل نظام ہے۔ کیونکہ اس میں (PRIVATE ENTERPRISE) کی عام اجازت اور حدود فراموش وسعت ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر بغور دیکھا جائے تو نظام سرمایہ داری کا یہ کہنا کہ اس میں افراد کی ساری دولت افراد کی ملکیت میں رہتی ہے، فریب اور سراب سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ محنت کشوں سے زائد دولت براہِ راست چھینتی ہے۔ کیپٹل ازم کا نظام نائد دولت مختلف قسم کے (TAXES) کے ذریعہ کھینچ لیتا ہے۔ استبداد دونوں جگہ کارفرما ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ اشتراکی نظام میں محنت کش اپنی فاضلہ کمائی برضا و رغبت اسٹیٹ کے حوالے کرتے ہیں، نہ نظامِ سرمایہ داری میں لوگ بطیب خاطر ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس کی رُو سے افراد زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور اپنی فاضلہ کمائی برضا و رغبت نظام کے حوالے کر دیں۔ پروفیسر (TAWTREY) نے کہا ہے کہ

جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے ممیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس

نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔[1]

یہ جذبۂ محرکہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔

قرآنی جذبۂ محرکہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے زندگی کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ انسانی جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ جسم کی پرورش ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں ایک فرد خود کھاتا یا استعمال کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسروں کو کھلاتے جائیں اور جسم آپ کا تنومند و توانا ہوتا جائے۔ لیکن، اس کے برعکس،

انسانی ذات کی نشوونما کا قانون

انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قانون یہ ہے کہ ایک فرد کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ لہٰذا جس قدر کوئی فرد دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا جائے گا۔ اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی کا مقصود، اپنی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو، وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے کمائیگا۔ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھے گا اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے گا۔ ایسے شخص سے محنت کرانے کے لئے ڈنڈا یا ہنٹر تو ایک طرف، کسی وعظ و نصیحت کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ نیز وہ جو کچھ دوسروں کو دے گا، اس کے لئے بدلہ یا معاوضہ تو کجا، شکریہ تک کا بھی خواہاں نہیں ہوگا، کیونکہ وہ انہیں جو کچھ دیتا ہے خود اپنی ذات کی منفعت کے لئے دیتا ہے۔ ان پر احسان نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جب دوسروں کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں تو ان سے کہدیتے ہیں اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تمہاری پرورش کے لئے جو انتظام کرتے ہیں تو یہ صرف قانونِ خداوندی کے اتباع میں کرتے ہیں (کہ ایسا کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے) اس کے لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی خواہاں نہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں خود تنگی ہی میں گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹/۹) کھیتیاں انہی کی پروان چڑھتی ہیں جو مفاد پرستانہ جذبات سے محفوظ رہیں۔

یہ ہے وہ جماعت جو دنیا میں نظامِ ربوبیت قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ انہی کو جماعتِ مومنین یا حقیقی معنوں میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پوری پوری محنت کرتے ہیں، اس لئے کہ یہ جانتے ہیں کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح پیہم محنت اور مسلسل سعی و کاوش سے انہیں جو کچھ ملتا ہے، وہ اُس میں سے بقدرِ ضرورت اپنے لئے رکھتے ہیں اور باقی سب مملکت کی

---

[1] QUOTED BY E.H. CARR IN "THE NEW SOCIETY". P.60

تحویل میں دے دیتے ہیں، تاکہ وہ اس سے خدا کی عالمگیر ربوبیت کی عظیم ذمہ داری کو پورا کرے۔ اپنی ضروریات کے تعین میں

ضروریات کا تعین

بھی وہ نہ اسراف سے کام لیتے ہیں، نہ تبذیر سے۔ یعنی نہ ضرورت سے زائد خرچ کرتے ہیں، نہ بلا ضرورت دولت ضائع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۶/۱۴۲) "خدا اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" اور اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (۱۷/۲۷) "دولت ضائع کرنے والے شیاطین کے بھائی بند ہیں"۔

یہ ہے وہ معاشی نظام جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام میں آپ دیکھئے کہ نہ صرف انسان کا معاشی مسئلہ ہی نہایت اطمینان بخش طریق سے حل ہو جاتا ہے بلکہ انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کا بھی خود بخود استیصال ہو جاتا ہے۔ جب انسان کی ضروریاتِ زندگی خود بخود پوری ہوتی جائیں گی تو کوئی شخص ان ناپسندیدہ کاموں کے لئے تیار نہیں ہوگا جو اُسے موجودہ غلط معاشرے میں محض روٹی کی خاطر کرنے پڑتے ہیں اور جب وہ فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا۔ تو اُسے بددیانتی۔ چور بازاری۔ نفع خوری، سمگلنگ۔ فریب دہی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس وقت نہ زمیندار اور کاشتکار کے جھگڑے ہوں گے، نہ مزدور اور کارخانہ دار کے تنازعے۔ نہ صاحب جائداد اور کرایہ دار کے مناقشات ہوں گے نہ گاہک اور دکاندار کے قضیئے۔ اس وقت نہ تقسیم وراثت کی مقدمہ بازی ہوگی، نہ لین دین کی تکا فضیحی۔ اس وقت ہر شخص ضروریاتِ زندگی سے بے نیاز ہوگا اور اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف۔

کہہ دیا جائے گا کہ صاحب! یہ محض حسین خواب (UTOPIA) اور شاعرانہ تخیل ہے۔ اس قسم کا معاشرہ کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آپ اس جذبہ کو اس کے دل سے نکال نہیں سکتے۔ انسان کبھی ایسے

حسین خواب

نیک نہیں بن سکتے جیسی ان کی تصویر کھینچی جا رہی ہے۔ انسان شروع سے ایسا ہی رہا ہے اور ایسا ہی رہے گا۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے۔ انسان بدفطرت نہیں ہے۔ اس کی درحقیقت کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت، جمادات، نباتات و حیوانات کی ہوتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے۔ انسان کو کچھ بننے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اگر ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کر دو تو وہ اچھا انسان بن جائے گا۔ ان کی غلط تربیت کرو تو وہ بُرا انسان ہو جائے گا۔ ہم غلط معاشرہ قائم کرتے ہیں۔ اس میں انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت غلط خطوط پر کرتے ہیں۔ جب اس قسم کے معاشرے پر دو چار صدیاں گذر جائیں تو ظاہر ہے کہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے اس میں اُسی قسم کے انسان پیدا ہونے لگ جائیں گے۔ ہم اس قسم کے خود غرض

خواب نہیں حقیقت

اور بد نیت انسان پیدا تو خود کرتے ہیں لیکن (خود بری الذمہ ہونے کے لئے) کہہ دیتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ اگر ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح تصورات زندگی کے مطابق کریں اور اس طرح دو چار نسلوں تک کر جائیں تو پھر نظر آئے گا کہ ہمارے معاشرے میں کس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن،

عملی طریق نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے، ان افراد کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری (بلکہ لاینفک) قرار دیتا ہے جن کے ہاتھوں اس نظام کا قیام عمل میں آتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تم اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے ذہنی فضا کو سازگار بناؤ۔ اس کے ساتھ ہی تم اپنی آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت شروع کر دو۔ جوں جوں ان آنے والی نسلوں کا قلب و دماغ صحیح (قرآنی) قالب میں ڈھلتا چلا جائے، اس نظام کو بتدریج آگے بڑھاتے جاؤ۔ تاکہ یہ اپنی آخری منزل تک پہونچ جائے۔

قرآن چونکہ انسانی زندگی کے ہر دور کے لئے راہ نمائی دیتا ہے۔ اس لئے اس نے جہاں اُس منزل کا پورا پورا تعارف کرا دیا ہے۔ جہاں پہونچ کر نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے، وہاں اُس نے اُس عبوری دور (TRANSITORY PERIOD) سے متعلق بھی احکامات و ضوابط دیدیئے ہیں۔ جس سے گذر کر یہ بتدریج آخری منزل تک پہنچتا ہے۔

عبوری دَور کے احکام اس (عبوری) دور کے احکام و قوانین بھی ایسے ہیں جو معاشرہ کو رفتہ رفتہ آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں خیرات و صدقات کی ترغیب۔ بخل اور حرص کی مذمت۔ ربوٰ کی ممانعت۔ زراندوزی کی مخالفت۔ وراثت کے احکام، سب اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ کہیں اس کا ارشاد ہے کہ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴) "جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے، تو انھیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے"۔ اور کہیں وہ کہتا ہے کہ تمہاری تباہی کی وجہ یہ ہے کہ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا۔ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۱۹، ۲۰) "تم وراثت کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دولت سے اس قدر محبت رکھتے ہو کہ چاہتے ہو کہ سب کا مال تمہارے ہی پاس آجائے"۔ کہیں وہ کہتا ہے کہ تباہی ان لوگوں کے لئے ہے جن کی ذہنیت یہ ہے کہ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۸۳/۲، ۳) "جب وہ دوسروں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انھیں ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں"۔ کہیں وہ مالیات کے مشیروں سے کہتا ہے کہ دولت کی تقسیم اس طرح نہ کرو کہ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (۵۹/۷) کہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اور کہیں قارون صفتوں سے کہتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لو کہ جس قدر مال و دولت تمہارے پاس جمع ہو رہا ہے اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸) یہ سب ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس پر ہمیں کامل تصرف حاصل ہے کہ جس طرح جی چاہے اسے صرف کریں! قرآن کے یہ احکام و ضوابط اپنی اپنی جگہ مستقل راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ لیکن جب نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں قائم ہوتا ہے تو اس میں چونکہ ضروریات ہر ایک کی پوری ہو جاتی ہیں اور فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی نہیں، اس لئے اُس وقت، اس جماعت (یا معاشرہ) کے لئے عبوری دور سے متعلق احکام کی ضرورت نہیں رہتی، جس طرح پانی مل جانے پر تیمم کے قرآنی حکم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح، قرآن بتدریج اُس نظام کو ان افراد کے ہاتھوں قائم کرا دیتا ہے جو صحیح

تعلیم و تربیت سے اسے چلانے کی صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔

لیکن اس کے معنی نہیں کہ اگر ایسی جماعت پیدا نہ ہو جو اس نظام کے قیام کے لئے کوشش کرے، تو قدرت چپکی بیٹھی منہ دیکھتی رہتی ہے۔ دنیا میں غلط نظامہائے زندگی کی تخریب، اور ان کی جگہ صحیح نظام کے قیام کے لئے خدا کا کائناتی قانون

کائناتی قانون

اپنے طور پر مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اسی کو کشمکشِ حق و باطل کہا جاتا ہے جو کائنات میں مسلسل جاری و ساری رہتی ہے۔ اس میں باطل کی شکست اور حق کا غلبہ لازمی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ قرآن کے الفاظ میں، اُس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ یہ اسی کائناتی قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے جس کی رُو سے (مثلاً) قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا۔ وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ۔ وَھُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۱۳/۴۱) "کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کس طرح زمین کو اس کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان معاملات کے فیصلے خدا (کا قانون) کرتا ہے۔ اُس کے فیصلے کو رد کرنا تو ایک طرف اس) پر نظرِ ثانی کرنے کا بھی کسی کو اختیار حاصل نہیں۔ وہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے"۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کا "بہت جلد حساب کرنا" بھی ہمارے حساب و شمار سے سینکڑوں برس لے لیتا ہے۔ لیکن اگر انسان چاہے کہ خدا کا یہ قانون، ہمارے حساب و شمار کے مطابق نتائج مرتب کرے، تو اس کا طریق یہ ہے کہ انسان اُس قانون کے ساتھ تعاون کرے اور اسے آگے بڑھانے کے لئے اس کے دست و بازو بن جائے۔ انسان اگر اس طرح خدا کے قانون کی مدد کرے گا، تو اس کا قانون خود انسان کا مددِ معاون بن جائے گا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (۴۷/۷) کے یہی معنی ہیں۔ اس طرح غلط نظام کی صفیں دنوں میں الٹ جائیں گی۔ اور اس کی جگہ صحیح نظام کی بساط بچھتی چلی جائے گی۔ نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاء (رضؓ) کی جماعت نے یہی کیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند دنوں کے اندر ایک ایسا محیر العقول انقلاب برپا ہو گیا جس کی مثال چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی اور جس کے اسباب و علل معلوم اور متعین کرنے کے سلسلہ میں دنیا بھر کے مؤرخ آج تک انگشت بدنداں ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اُس قانون کا ساتھ چھوڑ دیا اور اُسی نظامِ زندگی کو اختیار کر لیا جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا تو خدا کا کائناتی قانون پھر اپنی رفتار سے

دنیا از خود ادھر آ رہی ہے

چلنے لگ گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔ آپ اس ہزار سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کس طرح انسان اپنے ناکام تجارب کے بعد رفتہ رفتہ، غیر محسوس طور پر قرآنی نظامِ زندگی کے مختلف اجزاء کو اپنائے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی رفتار بہرحال سست ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ہم اس خطۂ زمین میں جسے ہم نے حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ ہم یہاں اسلام کا صحیح نظام قائم کریں، خدا کے کائناتی قانون کی رفاقت

میری کوشش

کا فریضہ سرانجام دیں تاکہ اس کے نتائج ہمارے حساب و شمار سے برآمد ہونے شروع ہو جائیں۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ تھا کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے تاکہ قرآن کا جو تصورِ زندگی اتنے عرصے سے نگاہوں سے

اوجھل ہو چکا ہے وہ پھر ہمارے سامنے آجائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد میں نے اپنی تمام مساعی کو اسی نقطہ پر مرکوز کر رکھا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ اب اگلا مرحلہ یہ ہے کہ پاکستان کا مجوزہ آئین انہی خطوط کے مطابق مرتب ہو جائے اور اس طرح کاروانِ ملت اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے جو اسے قدم بقدم قرآنی نظامِ ربوبیت کی آخری منزل تک لے جائے اگر ایسا ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان کس طرح کشاں کشاں اس نظام کے حیات پرور سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کے لئے آتا ہے اور کس طرح پھر یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (۱۱۰/۲) کا کیف آور منظر وجہ بالیدگیٔ قلب و نظر ہو جاتا ہے۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا (۳۹/۶۹) (زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی) کی بشارت کس طرح ایک زندہ شہادت بن کر سامنے آجاتی ہے۔

جو لوگ قرآن کے نظامِ ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کوشش کریں کہ آئینِ پاکستان اس نظام کا مظہر ہو اور مملکتِ پاکستان تمام افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی

استفسارات

تقریر کے بعد سامعین کی طرف سے کچھ سوالات کئے گئے جن کے وہیں جواب دیئے گئے۔ ان میں سے اہم سوالات اور ان کے جوابات درجِ ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ سوال۔ ہم بھوک کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تو پھر ہم بلا قصور عذابِ خداوندی میں مبتلا کیوں کر دیئے گئے ہیں؟

جواب۔ اجتماعی جرائم اور ان کے نتائج کا سلسلہ انفرادی غلطیوں کی پاداش سے مختلف ہے۔ ایک قوم غلط نظام قائم کرتی ہے یا غلط روش اختیار کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ذلت و پستی، بھوک اور افلاس کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ عذاب آئندہ نسلوں تک برابر جاری رہتا ہے یعنی اس قوم کی ہر نئی نسل شروع ہی سے بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے یہ اس نسل کی پیش رو نسلوں کے اجتماعی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جسے اس نسل کو بھگتنا پڑے گا۔ بعینہٖ جس طرح اگر کسی قوم کی ایک نسل اچھے کام کرتی ہے تو وہ قوم خوشحال ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کی آنے والی نسلیں خوشحال پیدا ہوتی ہیں۔ انفرادی طور پر سمجھنا ہو تو یوں سمجھئے کہ تندرست ماں باپ کا بچہ پیدائشی طور پر تندرست ہوتا ہے اور جس بچے کے والدین کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوں اُسے وہ مرض پیدائش کے ساتھ (وراثت میں) مل جاتا ہے اور عمر بھر اس کا دکھ سہتا رہتا ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس کے لئے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ ہماری سابقہ نسلوں نے غلطی کی اور اس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ہم نے (تشکیلِ پاکستان کے بعد) خود غلط نظام قائم کیا اور ہم سے بھی جرائم بھی مسلسل سرزد ہوتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

ہم بھوک اور افلاس کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا ہمارے قصے میں تو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ہم بلاقصور عذابِ خداوندی میں مبتلا ہیں۔ البتہ اگر ہم نے اپنی سابقہ غلطیوں کی تلافی نہ کی تو ہماری آنے والی نسلیں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ ہم اپنے اسلاف کے جرائم کی سزا بھگت رہے ہیں۔

یہ ہے اجتماعی جرائم کا فلسفہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی رُو سے "قومیں" جہنم میں داخل ہوتی ہیں (دیکھئے سورۂ اعراف۔ آیت ۳۸)

(۲) سوال:۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی سابقہ نسلوں کے جرائم کی پاداش میں بھوک کے عذاب میں گرفتار ہیں لیکن اس سے ہماری عاقبت کیوں خراب ہو؟

جواب:۔ اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر مطمئن رہے اور اس عذاب سے نکلنے کی کوشش نہ کی تو ہمارے اس جرم کی پاداش میں ہماری عاقبت خراب ہوگی۔ لیکن اگر ہم نے یہاں صحیح نظام قائم کرنے کی کوشش کی تو پھر ہماری عاقبت خراب نہیں ہوگی خواہ یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو جائے یا اس کے بعد۔ اگر یہ نظام ہماری زندگی میں قائم ہو گیا تو ہماری یہ زندگی بھی خوشحال ہو جائے گی اور اگلی زندگی بھی سرسبز و شاداب۔ لیکن اگر یہ نظام ہمارے بعد قائم ہوا تو ہم بیشک عسرت کی زندگی بسر کرتے ہوئے مر جائیں گے لیکن ہماری اگلی زندگی شاداب ہوگی۔ اور ہماری آنے والی نسل کی زندگی خوش حال۔ اگر انھوں نے اس نظام کے استحکام کے لئے کوشش کی تو اس دنیا کی خوش حالی کے ساتھ ان کی اُخروی زندگی بھی شاد کام ہوگی۔ لیکن اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ان کی موجودہ زندگی تو آسانی سے گزر جائے گی لیکن آخرت تباہ ہو جائے گی۔

(۳) سوال:۔ آپ نے کہا ہے کہ جس قوم کی دنیاوی زندگی عسرت اور بدحالی کی ہوتی ہے۔ اس کی آخرت بھی تباہ و برباد ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی خوش حالی میں گزرتی ہے اسکی آخرت بھی سنور جاتی ہے۔ اقوامِ مغرب کی موجودہ زندگی بڑے عیش و آرام میں گذرتی ہے۔ کیا وہ آخرت میں بھی اسی طرح عیش کریں گے؟

جواب:۔ آپ نے مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کرنے میں عجلت کی ہے۔ صورت یہ ہے کہ اس دنیا میں رزق کی کشادگی خدا کے طبعی قوانین سے وابستہ ہے جو قوم ان قوانین کے مطابق تسخیرِ فطرت کریگی اس کی زندگی خوشحالی میں گذرے گی ـــــ وہ قوم مسلم ہو یا غیر مسلم ـــــ قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں خدا کسی میں تفریق نہیں کرتا۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۰) جو چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے مفت عطا کی ہیں۔ یعنی سامانِ رزق ـــــ وہ زمین کے دسترخوان پر کھلی پڑی ہیں جس کا جی چاہے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لے۔ جو قوم ان کے حاصل کرنے میں جس قدر محنت کرے گی اسے اسی قدر مل جائے گا۔ یہ نہیں کہ خدا نے غیر مسلموں کے راستے میں بند لگا دیئے ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر انھیں حاصل نہیں کر سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس دنیا کی متاع، ہر قوم کو باندازۂ سعی و عمل مل جاتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم قوم اس کے لئے محنت کرتی ہے تو اسے دنیا میں خوش حالی نصیب ہو جاتی ہے۔ جماعتِ مومنین، زندگی کے ہر شعبہ میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتی ہے اسلئے اسکی دنیاوی زندگی یقیناً سرفرازی اور سربلندی کی زندگی ہوتی ہے اور چونکہ اس کے نزدیک زندگی اسی دنیا کی نہیں بلکہ وہ موت کے بعد بھی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے اس کی اُخروی زندگی بھی تابناک ہوتی ہے۔

جو غیر مسلم قوم دنیاوی متاعِ زیست کے لئے کوشش کرتی ہے اسکی دنیاوی زندگی خوشحال ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندگی کو اس دنیا تک محدود سمجھتی ہے اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانینِ خداوندی پر یقین نہیں رکھتی اسلئے اسکی اُخروی زندگی ناکام رہتی ہے۔ اقوامِ مغرب

کی یہی حالت ہے۔ لیکن جو قوم بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس سے نکلنے کی کوشش نہ کرے، اسکی دنیاوی زندگی بھی عذاب میں گذرتی ہے اور اخروی زندگی بھی عذاب میں۔ ہم (بدقسمتی سے) اسی شق میں آتے ہیں۔

(۴) سوال:۔ کیا اسلامی مملکت کے نظامِ ربوبیت میں غیر مسلموں کا بھی حصہ ہوگا؟

جواب:۔ قرآنی نظامِ ربوبیت میں ہر فرزند آدم کا حصہ ہوگا خواہ اس کا مذہب و مشرب کچھ ہی کیوں نہ ہو جس ملک میں حالت یہ ہو کہ اگر ایک کتا بھی بھوک سے مرجائے تو اسکی ذمہ داری معاشرہ پر عائد ہو، اس میں کسی انسان کی بھوک کو کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے؟ خدا کی (رب العالمینی والی ربوبیت) انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتی۔

(۵) سوال:۔ جب نظامِ ربوبیت میں تمام انسانوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں گی تو پھر قرآنی نظام کے سامنے کیا پروگرام ہوگا؟

جواب:۔ جیسا کہ دورانِ تقریر میں بتایا گیا ہے قرآن کی رُو سے انسانوں کو بنیادی ضروریات کی پریشانیوں سے اسلئے فارغ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کامل اطمینان اور سکون سے کر سکیں۔ انسانی ذات کی ممکنات جن کی نشوونما مقصودِ حیات ہے، اتنی وسیع ہیں کہ ہم اس وقت جبکہ ہمیں شعور ذات تک بھی نصیب نہیں، اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ بہت بڑا پروگرام ہے۔ معلوم جب افرادِ انسانیہ کی ذات میں نشوونما ہوگا تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے گی۔

یہ تو رہا انسانی ذات کی نشوونما کا قصہ۔ ویسے اگر محض بنیادی ضروریات کے پورا کرنے کے پروگرام کو لیا جائے تو وہ بھی اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے اس نظام کو صرف انسانوں کی ضروریات تک محدود نہیں رکھا۔ اس نے "دآبۃ" کہا ہے جس کے معنی ہر ذی حیات یا ہر چلنے والا ہے۔ نیز "دآبۃ" کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وہ اسی زمین میں نہیں اجرامِ فلکی میں بھی موجود ہیں (وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۴۲/۲۹) یورپ کے سائنسدان کے سامنے صرف اجرامِ فلکی کا مسخر کرنا ہے اور وہاں کے سیاسی مدبر ان کے پیشِ نظر ان جدید دنیاؤں میں اپنی استعماریت کی توسیع لیکن قرآنی نظام ان حالات میں یہ سمجھے گا کہ ان اجرام میں بسنے والے "دآبۃ" کی پرورش کی ذمہ داری بھی اُس کے فرائض میں شامل ہو جائے گی کیونکہ اس کے خدا نے اپنے آپ کو رب العالمین کہا ہے۔ اور عالمین میں پوری کائنات آجاتی ہے بہرحال، آپ گھبرائیے نہیں۔ قرآنی نظام کا پروگرام اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو جائے گا کہ آپ کے کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہ رہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(۶) سوال:۔ پاکستان میں قرآنی نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب:۔ سب سے پہلے اس فکر کو عام کرنا چاہیئے کہ دین کا مقصود اس نظام کا قیام ہے اور اسلامی مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس فکر کے عام کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے نئے آئین میں یہ بات درج ہو جائے کہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات اور ان کی ذات کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرنا مملکت کی ذمہ داری ہے جب مملکت اس فریضہ کو اپنے ذمے لے گی تو اس نظام کا قیام عمل میں آجائے گا۔ اسکے لئے وقت ضرور لگے گا۔ آئین میں اس شق کے شامل ہو جانے سے ہماری منزل کا تعین تو ہو جائے گا۔ آپ اس فکر کے عام کرنے میں جس قدر کوشش کریں گے، اسی قدر اس نظام کے قیام کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔

انسان اور خارجی کائنات

۳۱ اگست ۱۹۵۹ء کی شام محترم پرویز صاحب نے، لا کالج ہال کراچی میں، عنوان بالا پر ایک جامع تقریر فرمائی۔ سامعین میں زیادہ تعداد طالب علموں اور اساتذہ حضرات کی تھی۔ دیگر اہل علم طبقہ بھی کثیر تعداد میں شریک اجتماع تھا۔ تقریر کا ماحصل درج ذیل کیا جاتا ہے۔

افراد ہوں یا اقوام (اقوام بالخصوص) ان کی موت و حیات کے فیصلے کے لئے ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ خارجی کائنات سے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ یا ردعمل کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس نے انسان کو ہمیشہ وقتِ اضطراب رکھا ہے۔ قرآن نے اسے بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا صحیح جواب، نہایت واضح اور بیّن الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جب انسانی شعور نے پہلے پہل آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر مسلسل آتش باری کرنے والا عظیم اور مہیب گولا۔ چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ۔ اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں۔ یہاں وہاں کف بزداں اور سیلاب در آغوش دریاؤں کی خوں سامانیاں۔ میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدھے۔ کبھی بادل کی لرزہ انگیز گرج۔ کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک۔ کبھی وحشت انگیز آندھی، کبھی بلاخیز جھکڑ۔ کبھی کوہ آتش فشاں کی مرگ سیال کی یلغار۔ کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم۔ بشش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدھام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سروسامان، نہتا ابنِ آدم۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا ردعمل اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ جو بلا سامنے آئے یہ گڑگڑانا شروع کر دے۔ جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے یہ زمین پر سر رکھ دے۔

انسان کا پہلا ردعمل اس طرح فطرت کی ہر قوت اس کا "الٰہ" اور یہ اُن قوتوں کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر، حتیٰ کہ وبائی امراض، سب دیوی اور دیوتا تصور کر لئے گئے۔ اور ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز، منت و سماجت اور مدح و ستائش سے انہیں خوش کرنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا

(اُس ماحول میں) انسان کا اولیں ردِ عمل خارجی کائنات کے متعلق۔ رفتہ رفتہ اس ردِ عمل نے مذہب کی شکل اختیار کرلی۔ اور یہ آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ یا تصور مذہب کی شکل اختیار کرلے، تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب، کائنات کے متعلق انسان کے اسی اولیں ردِ عمل کے مظاہر ہیں۔

یہ توہم پرستی کی دنیا تھی۔ دوسری طرف جہانِ علم و بصیرت کی طرف آیئے تو وہاں (بدقسمتی سے) انسانیت ایک ایسے حادثے سے دوچار ہوئی جس نے توہم پرستی کی جہالت سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ جہاں تک تاریخی نوشتے ہماری راہ نمائی کرتے ہیں، علم و حکمت کا اولیں گہوارہ خطۂ یونان تصور کیا جاتا ہے۔ اور سقراط کو وہاں کے حکماء کا ابوالآباء قرار دیا جاتا ہے۔ سقراط کا نظریہ تھا کہ مطالعہ کے قابل صرف انسان کی ذات ہے۔ خارجی کائنات نہیں۔

افلاطونی نظریہ افلاطون، جو سقراط کا شاگرد لیکن خود ایک الگ مکتبِ فکر کا امام ہے، اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا اس نے کہا کہ یہ دنیائے محسوسات (خارجی کائنات) درحقیقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ حقیقی دنیا عالمِ اشال (WORLD OF IDEAS) کی ہے جو کہیں آسمانوں کے افلاک واقع ہے اور یہ مرئی کائنات اُس دنیا کا عکس ہے۔ اس نظریہ سے جو منطقی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے یعنی جب یہ عالمِ محسوسات، درحقیقت اپنا وجود نہیں رکھتا بلکہ محض فریبِ اور سراب ہے (بلکہ عالمِ خواب) تو اس کے متعلق جو علم انسانی حواس (SENSES) کے ذریعہ حاصل ہوگا وہ بھی اپنی کچھ حقیقت نہیں رکھے گا۔ حقیقی علم وہی ہوگا جو انسان کو چشم بند و گوش بند و لب بہ بند کے بعد — اپنی دنیا میں جذب ہو جانے سے حاصل ہو۔ یہی علم قابلِ اعتماد اور یقینی ہوگا۔ محسوسات کا علم (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوگا۔

یہ تھا کائنات اور علمِ محسوسات کے متعلق افلاطون کا وہ نظریہ جس پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ یہ تصوف وہاں سے نکل کر ساری دنیا کو متاثر کر گیا۔

یہ تصوف کا نظریہ ہے اس نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ اس (ہندو) فلسفہ کی رو سے، پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ کائنات برہما (خدا) کا خواب ہے۔ جس دن اس کی آنکھ کھل گئی یہ خواب معدوم ہو جائے گا۔ یہ عظیم کارگہ کائنات، ایشور کی لیلا (ناٹک کا کھیل) ہے جس میں کوئی شے اپنے حقیقی رنگ میں سامنے نہیں آتی۔ بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی مغنیوں کے ہاتھوں "شرابِ معرفت" بن کر چھلکا اور عیسائیت کی خانقاہوں تک کو کیف آلود کر گیا۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ تھا کہ کائنات کو باطل قرار دیدیا گیا اور دنیا ایک قابلِ نفرت شے تصور کر لی گئی جس سے دور بھاگنے میں ہی انسانی نجات کا راز پوشیدہ سمجھا گیا۔

یہ تھا کائنات کے متعلق ذہنِ انسانی کا ردِ عمل اُس زمانے میں جب قرآن نازل ہوا۔ یعنی دنیائے مذاہب، کائناتی قوتوں کو معبود بنا کر ان کے سامنے سجدہ ریز تھی اور عالمِ تصوف کائنات کو باطل قرار دے کر اس سے نفرت میں، روحانی ترقی کا راز پا رہا تھا۔ (اس میں شبہ نہیں کہ قرآن سے پہلے بعض قرائن ایسے ملتے ہیں جن میں کائنات کی صحیح پوزیشن بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ وحی پر مبنی تعلیم کا اثر تھا جو مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً آتی رہی۔ لیکن چونکہ نزولِ قرآن کے وقت وحی کی تعلیم اپنی اصل اور حقیقی

شکل میں کہیں بھی موجود نہ تھی اس لئے فکر انسانی کی عمومی حالت وہی تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے)

قرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے مذہب کی دنیا کو للکارا۔ اس نے پہلے ہی پارہ کے ابتدا میں انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا۔ واضح رہے کہ قصۂ آدم کسی فرد ("بابا آدم") کی داستان نہیں۔ آدم، خود آدمی ہے اور اس کا قصہ آدمی کی اپنی کہانی ہے۔ اس نے کہا کہ آدمی کا مقام یہ ہے کہ

قرآن کا تصوّر

فطرت کی تمام قوتیں (جنہیں قرآن ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے) اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں[1]۔ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا (۲/۳۴) اس ایک (انقلاب انگیز) اعلان سے، قرآن نے مسجود کو ساجد اور ساجد کو مسجود بنا دیا۔ اس نے انسان سے کہا کہ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ (۱۴/۳۳) خدا نے چاند اور سورج کو تیرے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے کہ وہ تیری خدمت میں منصروف خرام رہیں وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۱۴/۳۳) اس نے دن اور رات کو بھی تیرے لئے تابع فرمان بنا دیا ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ (۱۴/۳۲) اس نے دریاؤں (اور سمندروں) کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ المختصر یہ کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرو اور ان کے ذریعہ ان تمام قوتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کس طرح مقامِ آدم کو بے نقاب کر کے کائنات اور خود انسانی دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ اس کی اس حقیقت کشا تعلیم سے ذہنِ انسانی کے تراشیدہ دیوی، دیوتا، جن، بھوت پریت سب اس کے حضور دست بستہ خدمت کے لئے حاضر ہو گئے۔ اور پتھروں کے سامنے ماتھا رگڑنے والا انسان، کس طرح آسمان کی بجلیوں تک کا مخدوم و مسجود بن گیا!

دوسری طرف قرآن نے دنیائے تصوف کو پکارا اور ایک غلغلہ انگیز نعرہ سے طلسمِ فلاطون کی دھجیاں فضائے بسیط میں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ کائنات

طلسمِ فلاطون کی شکست

کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ہم نے باطل پیدا نہیں کیا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ یہ ان لوگوں کا وہم و قیاس ہے جو حقیقت کا انکار کرتے ہیں فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) اور جو حقیقتِ ثابتہ کا انکار کر کے، کائنات کو باطل بتاتے ہیں، ان کی سعی و عمل راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور آخر الامر ان کے حصے میں ندامت و پشیمانی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کائنات کے متعلق غلط زاویۂ نگاہ کو کفر (اور اس کے برعکس صحیح زاویۂ نگاہ کو ایمان) قرار دے کر اس سوال کو کتنی اہمیت دی ہے؟ جو شخص کائنات کو باطل قرار دے، وہ قرآن کی رو سے مومن نہیں کافر ہے۔ خدا نے

---

[1] تفصیل ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔ اس نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹/۴۴) اس میں ایمان والوں کے لئے (بہت بڑی) نشانی ہے۔

یہ کھیل تماشہ نہیں

کائنات کو الشور کی لیلا قرار دینے والوں سے اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا لٰعِبِیْنَ (۴۴/۳۸) ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ وَمَا خَلَقْنٰھُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۴/۳۹) ہم نے انھیں بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ خیال کہ کائنات یونہی بطور کھیل تماشہ کے پیدا کر دی گئی ہے، ان لوگوں کا وہم ہے جو علم (حقیقت) سے بے خبر ہیں۔

کائنات کے متعلق زاویۂ نگاہ میں اس قدر تحیر انگیز انقلاب پیدا کرنے کے بعد ضروری تھا کہ علم بالحواس SENSE PERCEPTIONS) کے متعلق بھی انسانی نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) تمہارے سمع اور بصر اور فواد سب سے یہ پوچھا جائے گا کیا تم نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی؟ جسے صحیح سمجھا گیا تھا! یہ آیت بڑی غور طلب ہے۔

علم کی تعریف

اس میں علم اُسے کہا گیا ہے۔ جس کی شہادت سمع وبصر و فواد دیں۔ "سمع وبصر" انسانی حواس (SENSE) ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے متعلق معلومات فراہم کرکے فواد (MIND) تک پہنچا دیں۔ اور پھر فواد (MIND) ان سے استنباطِ نتائج کرے۔ علم کی اس تعریف (DEFINITION) میں علم بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) اور فکری و تصوراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) دونوں آجاتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک "سمع وبصر و قلب" کی اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں، اور جہنمی ہیں۔

سمع وبصر سے کام نہ لینے والے جہنمی ہیں

سورۂ اعراف میں ہے وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷/۱۷۹) شہری اور صحرائی آبادیوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انھیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ یعنی لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) اس لئے کہ یہ لوگ حقائقِ کائنات سے بے خبر رہتے ہیں۔

ان کے برعکس، وہ ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جن کے متعلق کہتا ہے کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (۳/۱۸۹) یقیناً کائنات کی بلندیوں کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں صاحبانِ

کائنات میں غور و فکر کرنے والے

عقل و شعور کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں ۔۔۔ ان ارباب دانش و بینش کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ (۳/۱۹۱) جو اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور تخلیق ارض و سما میں انتہائی غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے مسلسل تجربات اور پیہم مشاہدات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۱) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس عظیم سلسلہ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ سُبْحٰنَکَ یہ تجھ سے بہت بعید تھا کہ تیرا تخلیقی پروگرام بلا مقصد ہوتا۔ تیرے متعلق ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض ہماری کوتاہ علمی اور ریسرچ (تحقیق) کی کمی ہے جو ہم کائنات کی بہت سی چیزوں کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتے ہیں اور اس لئے ان کی زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم عدم علم کی بنا پر اشیائے کائنات کے تخریبی پہلو سے محفوظ رہیں فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۱) اس لئے کہ جو قومیں اشیائے فطرت کے متعلق تحقیقات نہیں کرتیں اور اس لئے ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں وہ دنیا میں ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرتی ہیں رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ۔ (۳/۱۹۲) اور ایسی قوموں کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ (وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ ۳/۱۹۱)

یہی مومن و متقی ہیں

اس مقام پر ان لوگوں کو جو اشیائے کائنات کے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد رموزِ فطرت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں قرآن نے "صاحبان عقل و بصیرت" کہا ہے۔ دوسرے مقام پر انھیں "مومنین" سے تعبیر کیا ہے جہاں کہا ہے کہ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۴۵/۳) "یقیناً کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مومنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے قوانین کے متعلق حتمی یقین رکھتے ہیں وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴۵/۴) اور تمہاری پیدائش میں دیگر جانداروں کی افزائش نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو کائنات کے بالحق ہونے پر) یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ (۴۵/۵) اور دن رات کی گردش میں۔ اور بارش میں جسے خدا بادلوں سے برساتا ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے اور ہواؤں کے رخ کی تبدیلی میں، ارباب عقل و فکر کے لئے نشانیاں ہیں۔

کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا گیا کہ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ۔ یہ وہ اللہ کی آیتیں ہیں جنھیں خدا حق کے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ جو اس کے بعد بھی حق پر ایمان نہیں لاتے ان سے پوچھو کہ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰہِ وَاٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ (۴۵/۶) یہ لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات کے بعد اور کس چیز پر ایمان لائیں گے۔؟

انہی سے ایمان حاصل ہوتا ہے

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے دو گوشے ہیں۔ ایک اشیائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا

کہ کائنات کے نظام کو ایک حکیم و خبیر ہستی اپنے محکم اٹل اور تعمیری قوانین کی رو سے چلا رہی ہے۔ دوسرے قرآنی تعلیم میں تدبر و تفکر جس نے اُس زمانے میں انسان کے لئے تسخیرِ کائنات کا اعلان کیا۔ جب ساری دنیا یا تو کائناتی قوتوں کو معبود بنائے ہوئے تھی اور یا اسے فریبِ نظر اور قابلِ نفرت سمجھ کر اس سے دُور بھاگتی تھی۔ ایسے ماحول میں اس قسم کی انقلاب آفریں آواز بلند کرنا کسی انسانی ذہن کا کام نہیں تھا۔ اس آواز کا سرچشمہ یقیناً وہی خدائے علیم و بصیر ہو سکتا تھا جو انسان اور کائنات دونوں کے صحیح مقامات سے باخبر ہو لہٰذا اگر کوئی شخص مطالعہ فطرت اور قرآن میں غور و تدبر کے بعد بھی خدا پر ایمان نہیں لاتا تو پھر کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس سے وہ خدا پر ایمان لا سکے۔

ایمان وہ تصورِ حیات ہے جو انسانی زندگی کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد تقویٰ آتا ہے۔ تقویٰ کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ وہ مسلک اور منہاج ہے جس کے مطابق مومن اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ مومنین کے لئے خارجی کائنات کے شواہد و مظاہر پر غور و فکر کس قدر ضروری ہے اس کے متعلق ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ یہ غور و فکر متقیوں کے لئے بھی ویسا ہی ضروری ہے۔ سورۂ یونس میں ہے اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (۱۰/۶) یقیناً اختلاف لیل و نہار اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا کیا ہے۔ ان میں تقویٰ شعار قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن نے سمٰوٰت والارض پر غور و فکر کرنے کی تاکید کی ہے۔ سمٰوٰت (اجرام فلکی) پر غور و فکر کا ایک شعبہ تو وہ ہے جسے علم الافلاک (ASTRONOMY) کہتے ہیں۔ لیکن قرآن اس بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ زمین میں ہی نہیں بلکہ اجرام فلکی میں بھی ذی حیات مخلوق ہے۔ اور اس کے متعلق غور و فکر کرنا بھی ضروری ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۲/۲۹) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سمٰوٰت کو پیدا کیا اور ان دونوں میں ذی حیات مخلوق کو پھیلا دیا۔ غور فرمائیے کہ آسمانی کرّوں میں زندہ مخلوق کی نشاندہی بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے کی کرائی ہے۔

آسمانوں میں ذی حیات مخلوق

قرآن کی رُو سے علم کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے، یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی علم وہ ہے جس کی شہادت انسان کے حواس دیں اور جس کی تائید اس کا قلب (HEART) کرے۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کے نزدیک عالم کون ہے؟ قرآن میں علماء کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ سورۂ شعراء میں (۲۶/۱۹۷) اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ یہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ اور دوسری جگہ سورۂ فاطر میں جہاں خدا کے بندوں میں سے علماء کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (۳۵/۲۷) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ

عالم کی تعریف

سُوْدٌ (۳۵/۲۷) اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں۔ اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ط اور اس طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے؟ کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا۔ سائنس کے مختلف علوم کا جن میں طبیعیات (PHYSICS)۔ نباتات (BOTANY)، حیوانات (ZOOLOGY)۔ طبقات الارض (GEOLOGY)۔ فضائیات (METEOROLOGY) اور عالم انسانیت کے تمام شعبے آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے "علماء" ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھا جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۸) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر اس کی منزلِ مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان کے لئے جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہا جاتا ہے۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کائناتی مظاہر پر غور کریں، اسی طرح خود قرآن کے حقیقتِ ثابتہ ہونے کا یقین بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خارجی کائنات اور دنیائے انسانیت میں غور و فکر کریں۔ اس کا ارشاد ہے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) ہم انہیں اپنی نشانیاں عالم آفاق اور عالم انفس میں دکھائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات ابھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یعنی جوں جوں کائنات کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے حقائق، مشاہدہ علم و تحقیق سے کھلتے جائیں گے۔ قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۱/۵۳) قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے اور یہ چیز اس امر کی کافی دلیل ہے کہ حقائقِ کائنات کے متعلق جو کچھ خدا کہے گا وہ یقینی طور پر درست ہوگا اَنْزَلَهٗ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵/۶) قرآن کو اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔ لہٰذا جو لوگ انفس و آفاق کی ان نشانیوں پر غور و فکر کریں گے انہیں ان میں تجلیاتِ خداوندی بے نقاب نظر آجائیں گی۔ جو قومیں ان آیات اللہ سے آنکھیں بند کر کے گذر جاتی ہیں، یوں سمجھو کہ انہیں "خدا" کو اس طرح اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لینے پر یقین نہیں ہوتا۔ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ (۴۱/۵۴) حالانکہ انہیں اس لئے کہیں دور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ جس شے کی بھی ریسرچ شروع کر دیں، اس میں خدا کا قانونِ ربوبیت جھلمل کرتا نظر آجائے گا۔ اس لئے کہ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ

انفس و آفاق میں آیات

لقاءِ رب

شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (۴۱/۵۴) خدا کا قانونِ ربوبیت ہر شے کو محیط ہے۔ وہ ایک شے کے ساتھ مختص نہیں۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ کائنات میں مومنین اور متقین کے لئے ہر جگہ آیاتُ اللہ ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایمان اور تقویٰ کے معنی اشیائے کائنات پر غور و فکر اور تحقیق و تدقیق ہے اور جو قومیں تسخیرِ فطرت کرتی ہیں وہ مومن اور متقی ہوتی ہیں۔

صرف تسخیرِ فطرت ایمان نہیں

مومن و متقی وہ ہیں جو تسخیرِ فطرت کے بعد فطرت کی قوتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق (نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے صرف کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں۔ یعنی تسخیرِ فطرت اور اتباعِ قوانینِ خداوندی، جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ مومن و متقی نہیں کہلا سکتی وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں"۔ جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کر لیتی ہیں لیکن امورِ زندگی کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتیں وہ بھی ان قوموں کی طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں جو سرے سے تسخیرِ فطرت نہیں کرتیں۔ یہی وہ قومیں ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ سَمْعُھُمْ وَلَآ اَبْصَارُھُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُھُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ (۴۶/۲۶) "ان کے سمع و بصر و فواد ان کے کسی کام نہ آئے کیونکہ وہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے۔ وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ لہٰذا

مومن ہونے کی شرائط

حاصلِ مبحث

قرآن کی رُو سے صورتِ حالات یُوں ہوئی کہ

(۱) جو قومیں سمع و بصر و فواد سے کام لے کر تسخیرِ فطرت کرتی ہیں اور پھر فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی (قرآن) کے مطابق صرف کرتی ہیں وہ مومن و متقی ہیں۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ و تابناک ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگوار و شاداب۔

(۲) جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں وہ صرف مقامِ آدمیت تک پہنچتی ہیں مومن و متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں وہ اس دنیا کی زندگی میں قوت و شوکت حاصل کر لیتی ہیں لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔

(۳) اور جو قومیں سرے سے تسخیرِ فطرت کرتی ہی نہیں، وہ مومن و متقی ہونا تو کجا، مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ (۴۱/۲۸) ان کے لئے اس دنیا میں ذلت و خواری ہے۔ اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی۔ اس لئے کہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی (۱۷/۷۲) جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں کا بھی اندھا ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

مجلسِ اقبال

خلاصۂ مطالبِ مثنوی ——— در تفسیرِ سورۂ اخلاص

علامہ اقبالؒ نے اپنی مثنوی 'اسرار و رموز' کے آخری باب میں، مثنوی کے نفسِ مضمون کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ چونکہ اس باب میں خود مصنف نے اپنی تصنیف کا خلاصہ چند صفحات میں سمٹا دیا ہے۔ اس لئے یہ باب خاص طور پر غور و فکر کا محتاج ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے مثنوی اسرارِ خودی کے شروع میں 'خودی' پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ذات (PERSONALITY) جہاں بھی ہو، اس کے بنیادی خصائص (BASIC CHARACTERISTICS) ایک ہی ہوتے ہیں۔ فرق صرف ان کی وسعتوں میں ہوتا ہے۔ ذاتِ خداوندی لامحدود ہے۔ اس لئے اس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔ انسانی ذات (جو خدا کی عطا فرمودہ ہے) حدودِ بشریت کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی صفات بھی محدود ہیں۔ لیکن یہ صفات بہرنوع صفاتِ خداوندی ہی کا پرتو ہیں۔ اس لئے انسانی ذات کی صفات کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ صفاتِ خداوندی کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے قرآن کریم نے، صفاتِ خداوندی کا اس شرح و بسط سے تذکرہ کیا ہے۔ ان صفات کا یہ تذکرہ قرآن کریم کے صفحات پر مختلف مقامات پر پھیلا ہوا ہے۔ لیکن سورۂ اخلاص میں ذاتِ خداوندی کے بنیادی خصائص کو اس حسنِ ایجاز سے سمٹا کر بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی مثنوی کے مندرجات کا خلاصہ پیش کرنے کے لئے سورۂ اخلاص کو منتخب کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے بہتر انتخاب ہو نہیں سکتا تھا۔ دیکھئے کہ وہ ذاتِ خداوندی کے ان بنیادی خصائص کے تذکرہ سے خود انسانی ذات کے خصائص کی طرف کس طرح توجہ مبذول کراتے ہیں۔ اور کس بلیغ انداز میں اس حقیقت کو پیش کرتے ہیں کہ جو قوم ان صفات کی حامل ہو، اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ

من شبے صدیقؓ را دیدم بخواب　　گل ز خاکِ راہِ او چیدم بخواب
آں "اَمَنُّ النّاس" بر مولائے ما　　آں کلیمِ اولِ سینائے ما
ہمتِ او کشتِ ملت را چو ابر　　ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

میں نے ایک رات حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور خاک کے جو ذرات ان کی قدمبوسی سے پھول بن رہے تھے انھیں اپنے دامنِ عقیدت میں جمع کیا۔ وہ صدیق اکبرؓ جن کے متعلق خود نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ حضورؐ پر ان کے احسانات سب سے زیادہ ہیں۔ (مردوں میں) اسلام لانے والوں میں بھی سب سے اول ہیں اور زندگی کے ہر مرحلہ میں حضورؐ کے رفیقِ اوّل بھی۔

گفتمش۔ اے خاصۂ خاصانِ عشق　　عشقِ تو سرِ مطلعِ دیوانِ عشق
پختہ از دستت اساسِ کارِ ما　　چارۂ فرما پئے آزارِ ما

میں نے اُن سے عرض کیا کہ ہمارے مقاصدِ حیات کی عمارت کی بنیاد میں آپ کے مقدس ہاتھوں سے پختگی پیدا ہوئی ہے۔ آپ ہمارے ملی امراض کا علاج تجویز فرمائیے۔

گفت تا کے در ہوس گردی اسیر　　آب و تاب از سورۂ اخلاص گیر
اینکہ در صد سینہ پیچد یک نفس　　سِرّے از اسرارِ [illegible] توحید است و بس
رنگِ او برکن مثالِ [illegible] شوی　　در جہاں عکسِ جمالِ او شوی

آپؓ نے کہا کہ ملت [illegible] تمام امراض کا علاج اس [illegible] ہے کہ وہ صفاتِ خداوندی کی حامل بن جائے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جس طرح ایک [illegible] ردی ذات کی نشوونما سے اس میں صفاتِ خداوندی (حدودِ بشریت کے اندر) منعکس ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب ایک [illegible] مت اپنے معاشرہ کی تشکیل قوانینِ خداوندی کے مطابق کرتی ہے تو وہ بھی صفاتِ خداوندی کی حامل بن جاتی ہے۔ [illegible] وقت ملتِ اسلامیہ کے امراض میں سب سے پہلا اور بنیادی مرض ان کا باہمی اختلاف ہے۔ اس اختلاف کو دور کرنے کا [illegible] یہ ہے کہ مختلف مقامات میں بسنے والے مسلمان اپنے معاشرہ کو قوانینِ خداوندی (قرآن کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصول) [illegible] کے مطابق متشکل کر لیں۔ اس سے ان میں وہ وحدت پیدا ہو جائیگی جو خدا کی احدیت (توحید) کی لازمی خصوصیت ہے۔

آنکہ نامِ تو مسلماں کردہ است　　از دوئی سوئے یکی آوردہ است
خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ　　وائے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

خدا نے تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا۔ اس سے اس کا مقصود تمہارے اندر وحدت پیدا کرنا تھا۔ لیکن تم نے اپنے آپ کو قبیلوں، خاندانوں اور قوموں میں تقسیم کر کے اپنی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور اس طرح اسلام لانے کے بعد پھر عہدِ جاہلیت کی تشتت و انتشار کی زندگی

کی طرف لوٹ گئے۔

علامہ اقبالؒ نے یہاں صرف مسلمانوں کی قومی تفریق کا ذکر کیا ہے لیکن دیگر مقامات میں انھوں نے مذہبی فرقہ بندیوں کو بھی ان کا بنیادی مرض قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی فرقہ بندی، قومی تفریق سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ یہ تفریق ایک ہی خطۂ زمین میں بسنے والے اور ایک ہی نسل سے متعلق مسلمانوں کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے مذہبی فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ

داریہاں نامیدہ را از نامہا
ساز باخم در گذر از جامہا

تم نے جس قدر الگ الگ نام رکھ چھوڑے ہیں (ترک۔ افغان۔ حنفی۔ اہل حدیث۔ وغیرہ) ان سب کو ترک کر کے اپنے آپ کو صرف "مسلم" کہو اور اس طرح اپنا رشتہ اہلِ اسلام سے پیوست کر لو۔

اے کہ تو رسوائے نام افتادۂ　　　از درختِ خویش خام افتادۂ
با یکی ساز از دوئی بردار رخت　　　وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت

تم نے مختلف نام اختیار کر کے، اپنی وحدت کو کھو دیا اور یوں، ایک ثمرِ خام کی طرح شجرِ اسلام سے نیچے آگرے۔ تمہیں چاہیئے کہ پھر اپنی اصل سے پیوستہ ہو کر اپنی وحدت کو مستحکم کر لو۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زندگی بسر نہ کرو۔

اے پرستارِ یکی۔ گر تو، توئی　　　تا کجا باشی سبق خوانِ دوئی
تو درِ خود را بخود پوشیدۂ　　　در دل آور آنچہ بر لب چیدۂ

تم توحید کا اقرار کرتے ہو۔ خدائے واحد کے پرستار کہلاتے ہو۔ دن بھر کلمۂ توحید تمہاری زبان پر رہتا ہے۔ تو جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو۔ اسے دل کی گہرائیوں میں جگہ کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کر رکھا ہے اور پھر رو رہے ہو کہ ہم کمرے میں بند ہیں۔ اس دروازے کو تم خود ہی کھول سکتے ہو۔

صد ملل از ملتے انگیختی
بر حصارِ خود شبیخوں ریختی

خدا نے تمہیں امتِ واحدہ بنایا تھا۔ تم نے اُس ایک اُمت سے کئی اُمتیں بنا ڈالیں اور اس طرح قوموں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ یہ ہے تمہاری تباہی کا حقیقی سبب۔ تم غیروں کے ہاتھوں تباہ نہیں ہوئے خود اپنے ہاتھوں برباد ہوئے ہو۔ اس لئے تمہارا علاج بھی تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے لئے

یک شو و توحید را مشہود کن　　　غائبش را از عمل موجود کن

لذتِ ایماں فزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

تم اپنے اختلافات مٹا کر پھر سے ایک ہو جاؤ۔ اور اس طرح خدا کی صفتِ احدیت کو اپنے اندر مشہود (MANIFEST) کرکے دکھا دو۔ توحید خداوندی پر تمہارا زبانی ایمان کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس "زبانی ایمان" کو اپنے عمل سے زندہ کرکے دکھاؤ۔ یاد رکھو! جو ایمان عمل کے محسوس پیکروں میں جلوہ بار نہیں ہوتا، وہ 'ایمان' ایمان نہیں ہوتا۔

سورۂ اخلاص کی دوسری آیت ہے۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ

"صمدیت" بڑی جامع صفتِ خداوندی ہے۔ اس کے معنی ہیں خود کسی کا محتاج نہ ہونا اور دوسروں کی احتیاج میں ان کا سہارا بننا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے (انگریزی) خطبات میں اسے (FREEDOM) سے تعبیر کیا ہے۔ ذات کی دوسری بنیادی صفت "صمدیت" ہے۔ لہٰذا جب ملّتِ اسلامیہ اپنے اندر اس صفتِ خداوندی کو منعکس کرے گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کسی کے سہاروں کی محتاج نہیں رہے گی۔ وہ خود کفیل ہوگی اور اس طرح کاملاً آزاد۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

گر بہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ دل بستۂ　　　　از حدِ اسباب بیروں جستۂ
بندۂ حق بندۂ اسباب نیست　　　　زندگانی گردشِ دولاب نیست

اگر تم نے خدائے صمد سے دلبستگی پیدا کرلی ہے تو تم اسباب و علل کی حد سے آگے چلے گئے ہو۔ جس انسانی ذات میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو جائے (اسی کو "اللہ کا بندہ" ہونا کہتے ہیں) اس کی زندگی کولھو کے بیل کی سی نہیں رہتی کہ وہ مادی کائنات کے محدود دائرے میں چکر کاٹتا رہے۔ وہ زندگی کے صراطِ مستقیم پر چل کر ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

"اسباب و علل" سے بے نیاز ہو جانے کے یہ معنی نہیں کہ وہ دنیا میں مادی سامان و ذرائع سے کام نہیں لیتا۔ وہ ان تمام ذرائع سے کام لیتا ہے لیکن ان کے تابع نہیں ہو جاتا۔ وہ انھیں مسخر کرکے انھیں قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے مصرف میں لاتا ہے۔ اس لئے وہ اسبابِ فطرت کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم بن جاتا ہے۔

مسلم استی! بے نیاز از غیر شو
اہلِ عالم را سراپا خیر شو

تیرے مسلم ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ تو دنیا میں کسی کا محتاج نہ ہو اور ساری دنیا کے لئے سراپا خیر بن جائے۔ تیری ہستی، اہلِ عالم کے لئے منفعت بخشیوں اور نفع رسانیوں کا موجب ہو اور تو اپنی ذات کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو۔

پیشِ منعم شکوۂ گردوں مکن
دستِ خویش از آستیں بیروں مکن

تو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کر۔ اربابِ دولت سے اپنی خستگی کا شکوہ سنج نہ ہو۔ اپنے تیشے سے اپنا راستہ خود تراش اور اس طرح ہر جوئے کھٹ سے مستانہ وار بے نیاز گذر جا۔

چوں علیؓ درساز، بانانِ شعیر
گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر

اپنے ہاتھوں سے کمائی ہوئی جو کی روٹی پر گذارہ کر، اور اس طرح اپنے بازوؤں میں اتنی قوت پیدا کر لے جس سے تو ہر ظالم و سرکش اور ہر باطل پرست کی گردن حق پر جھکا سکے۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ "نانِ جویں" سے یہ مراد نہیں کہ زندگی کے معیار (STRANDARD OF LIVING) کو اتنا پست رکھو کہ تمہیں جو کی روٹی سے زیادہ کچھ میسر ہی نہ آئے۔ بالکل نہیں۔ قرآن کریم ملتِ اسلامیہ کی زندگی کے معیار کو بلند سے بلند تر درجہ پر لے جانا چاہتا ہے۔ جنت کی نعمتیں، مومن کے معیارِ زندگی ہی کی تصویریں ہیں۔ "نانِ جویں" سے مطلب یہ ہے کہ قرآنی معاشرہ کی تشکیل کے لئے جدّ و جہد کے دوران میں ایسے مراحل آئیں گے جن میں کم از کم اسباب زیست میسر ہونگے اگر ان اسباب کو قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق صرف کیا جائے تو ان سے ایسے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جو (باطل کے طریق پر حاصل اور استعمال کردہ) زیادہ سے زیادہ اسباب و وسائل سے بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب اس طرح پیہم جہاد اور مسلسل کاوش سے قرآنی معاشرہ متشکل ہو جائے تو پھر زندگی کا معیار خود ہی بلند سے بلند تر ہو جائے گا چنانچہ جب قرنِ اول میں اسلامی نظامِ ربوبیت قائم ہوا ہے تو خود حضرت علیؓ (جن کی نانِ جویں کی طرف علامہ اقبالؒ نے مختلف مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے) کا وظیفہ پانچ پانچ ہزار درہم مقرر ہوا تھا۔ اور پانچ پانچ ہزار ان کے صاحبزادگان امام حسنؓ اور امام حسینؓ کا۔ ان کا وظیفہ آگے چل کر اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔

منت از اہلِ کرم بردن چرا
نشترِ لا و نعم خوردن چرا

دولتمند خیرات کرنے والوں کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ایک دروازہ پر سوال کر کے کہیں سے ہاں اور کہیں سے نہ کے جوابات کے نشتر برداشت کیوں کئے جائیں؟ سوال کرنا ذات کی انتہائی ذلت ہے۔ خدائے صمدیت مآب کے بندوں کے لئے یہ شیوہ باعثِ ننگ ہے۔

رزقِ خود را از کفِ دوناں مگیر
یوسف استی خویش را ارزاں مگیر

کمینے لوگوں کے ہاتھ سے رزق لینا، وجۂ ننگِ انسانیت ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنی قدر و قیمت پہچانے۔ یہ حضرت یوسفؑ کی طرح ایک بے بہا متاع ہے۔ اسے اپنے آپ کو اتنا سستا نہیں کر دینا چاہیئے۔

گرچہ باشی مور ہم بے بال و پَر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

تو اگر ایک بے بال و پر چیونٹی ہے، تو بھی اپنی احتیاج کسی سلیمانِ عصر کے سامنے مت پیش کر۔ یہ ذات کی توہین ہے۔

راہ دشوار است، ساماں کم بگیر

در جہاں آزاد زی۔ آزاد میر

اگر تمہارے محاصل و ذرائع کم ہیں تو بجائے اس کے کہ دوسروں سے بھیک مانگ کر اپنی ضروریات پوری کی جائیں) کیوں نہ ضروریات کو اتنا کم کر دیا جائے کہ وہ اپنے ذرائع سے پوری ہو جائیں۔ آزادی بڑی نعمت ہے۔ اسے کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔

سبحۂ اقلل من الدنیا شمار

از تعش حراً شوی سرمایہ دار

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اپنی ضرورتوں کو کم کرکے آزادانہ زندگی بسر کرو۔ عسرت کے ایام میں یہ اصول بڑا انسانیت ساز ہے۔ اس سے انسان محتاجی کی لعنت سے محفوظ رہتا ہے۔

ناتوانی کیمیا شو۔ گل مشو

در جہاں منعم شو و سائل مشو

مومن کا شعار یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ربوبیت (پرورش) کرے نہ کہ خود اپنی پرورش کے لئے دوسروں کا محتاج ہو جائے۔

اے شناسائے مقامِ بوعلیؒ — جرعۂ آدم ز جامِ بوعلیؒ

پشت پا زن تختِ کیکاؤس را — سربدہ از کف مدہ ناموس را

خود بخود گردد درِ میخانہ باز

از تہی پیمانگانِ بے نیاز

بوعلیؒ (قلندر) نے کیا خوب کہا ہے کہ سر جائے تو جائے لیکن عزت و ناموس ہاتھ سے نہ جائے اگر ایک طرف تختِ جم و دارا ہو اور دوسری طرف ناموس کا سوال، تو تختِ خسروی کو تیاگ دو اور عزت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ جو شخص اپنے اندر اس قدر "صمدیت" پیدا کرے گا وہ دیکھے گا کہ اس کی نشو و نما کے سامان کس طرح پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

قایدِ اسلامیاں ہاروں رشید — آنکہ نقفور آبِ تیغ او کشید

گفت مالکؒ را کہ اے مولائے قوم — روشن از خاکِ درت سیمائے قوم

اے نوا پردازِ گلزارِ حدیث — از تو خواہم درسِ اسرارِ حدیث

ایک دفعہ ہارون الرشید نے (جس کے ہاتھوں رومی بادشاہ بھی کئی بار شکست کھا چکا تھا) امام مالکؒ سے کہا کہ آپ بغداد تشریف لایئے اور لوگوں کو درسِ حدیث دیجئے۔

لعل تا کے پردہ بند اندر یمن — خیز و در دار الخلافہ خیمہ زن

اے خوشا تابانیٔ روزِ عراق — اے خوشا حسنِ نظر سوزِ عراق
می چکد آبِ خضر از تاکِ او — مرہمِ زخمِ مسیحا خاکِ او

آپ کب تک یمن[1] میں بیٹھے رہیں گے۔ آیئے اور دیکھئے کہ (عراق میں) بغداد کی فضا کس قدر جاذبِ قلب و نظر ہے۔ یہاں آکر درسِ حدیث شروع کیجئے۔

گفت مالکؒ مصطفیٰ را چاکرم — نیست جز سودائے او اندر سرم
من کہ باشم لبۂ فراکِ او — برنخیزم از حریمِ پاکِ او
زندہ از تقبیلِ خاکِ یثرب — خوشتر از روزِ عراق آمد شبم

امام مالکؒ نے کہا میں نبی اکرمؐ کی درگاہ کا خادم ہوں۔ میں مدینہ طیبہ کو چھوڑ کر بغداد نہیں آسکتا۔ مدینہ طیبہ کی خاک میرے لئے سامانِ زیست ہے۔

عشق می گوید کہ فرمانم پذیر — پادشاہاں را بخدمت ہم مگیر
تو ہمی خواہی مرا آقا شوی — بندۂ آزاد را مولا شوی

میرے لئے عشق کا فرمان یہ ہے کہ ملازمت خواہ بادشاہ کی بھی کیوں نہ ہو، مت اختیار کرو۔ اس لئے میں تمہارا نوکر بن کر وہاں نہیں آنا چاہتا۔

امام مالکؒ کے جواب کا پہلا حصہ (اگر وہ انہی کا جواب ہے) تو کچھ ایسا دقیع نہیں تھا۔ معلم کو دیکھنا یہ چاہئے کہ اس کی تعلیم کے لئے کونسا مقام زیادہ مناسب اور کون سی فضا زیادہ سازگار ہے۔ یا کون سے مقام پر اس کی زیادہ ضرورت ہے اس میں بغداد و بصرہ کی کوئی تمیز نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن ان کے جواب کے دوسرے حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بادشاہوں کی نوکری غلامی کے مترادف تھی جس میں انسان کی آزادی بحیثیت سلب ہو جاتی تھی۔ اس نقطۂ نگاہ سے امام مالکؒ کا موقف قابلِ فہم تھا۔ ان کے جواب کا بقایا حصہ یہ ہے۔

بہرِ تعلیم تو آیم بر درت — خادمِ ملت نگردد چاکرت
بہرہ خواہی اگر از علمِ دیں — در میانِ حلقۂ درسم نشیں

تم یہ چاہتے ہو کہ میں، یہاں کے درس کو چھوڑ کر جس سے اس قدر لوگ مستفیض ہو رہے ہیں، تمہاری (فردِ واحد) کی تعلیم کے لئے بغداد آؤں۔ یہ ناممکن ہے۔ اگر تم علم سے کچھ حصہ لینا چاہتے ہو تو عام طالب علموں کی طرح میرے درس میں آکر بیٹھو۔ میرے ہاں بادشاہ اور فقیر میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔

---

[1] امام مالکؒ کا اصلی وطن یمن تھا۔ لیکن بعد میں وہ مدینہ طیبہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔

اس پر علامہ اقبال تبصرہ کرتے ہیں۔

بے نیازی نازہا دارد بسے
نازِ او اندازہا دارد بسے

جس انسان میں خدا کی صفتِ صمدیت جلوہ بار ہوتی ہے اس میں عجیب قسم کا استغناء پیدا ہو جاتا ہے اور یہ استغناء ڈر اور خوف کے تمام احساسات مٹا کر انسان کو بے حد خود دار بنا دیتا ہے۔

بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است
رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است

لیکن یہ بے نیازی، خدا کی صفتِ صمدیت کو اپنے اندر منعکس کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنے کی اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان تمام غیر خداوندی تصورات سے اپنے قلب و دماغ کو پاک کر لے۔

علمِ غیر آموختی اندر دختی
روئے خویش از غازہ اش افروختی

تم نے قوانینِ خداوندی (قرآن) کو چھوڑ کر انسانوں کے خود ساختہ تصورات کو اپنا سرمایۂ علم و حکمت بنا لیا۔

ارجمندی از شعارش می بری
من ندانم تو توئی یا دیگری

اب تمہاری حالت یہ ہو چکی ہے کہ تم ان (غیر قرآنی) تصورات کے اتباع میں فخر محسوس کرتے ہو اور انہی کے بل بوتے پر دنیا میں سرفرازی و سربلندی چاہتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا گوشت پوست تو یقیناً تمہارا اپنا ہے لیکن تمہاری روح، تمہاری نظر، تمہاری نہیں ہے۔ یہ دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہے۔ اس لئے دراصل وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔

از نسیمش خاکِ تو خاموش گشت
در گلُ و ریحاں تہی آغوش گشت

اس (غیر قرآنی) تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہاری زمین یکسر بنجر ہو گئی۔ اس سے زندگی کی کوئی کونپل نہیں پھوٹتی۔ کوئی پھول نہیں کھلتا۔

کشتِ خود از دستِ خود ویراں مکن
از سحابش گریۂ باراں مکن

تو غیروں کے بادل سے اپنی کھیتی کے لئے بارش کی بھیک نہ مانگ۔ اس طرح تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی کھیتی ویران کرے گا۔

عقلِ تو زنجیریٔ افکارِ غیر — در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار — در دلِ تو آرزو ہا مستعار

قمریانت را نواہا خواستہ مرو ہا ہیت را قبا ہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگراں جام ہم گیری بوام از دیگراں

تمہاری حالت یہ ہے کہ تمہاری عقل، غیروں کے افکار کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور تمہارے حلق میں سانس تک بھی تمہاری اپنی نہیں۔ تمہارے دلوں میں آرزوئیں اپنی نہیں۔ دوسروں سے مانگی ہوئی ہیں۔ تمہاری زبان پر گفتگو اپنی نہیں۔ دوسروں کی ہے۔ تمہارے چمن ملت کی قمریوں کے نغمات غیروں سے مانگے ہوئے ہیں۔ تمہارے سرو و صنوبر کی قبائیں تک غیروں کی ہیں۔ تم پیالوں میں شراب دوسروں کے ہاں سے لیتے ہو۔ نہیں! بلکہ پیالے تک دوسروں کے ہاں سے قرض لیتے ہو۔

آں نگاہش سرّ "مازاغ البصر" سوئے قوم خویش باز آید اگر
می شناسد شمع او پروانہ را نیک داند خویش و ہم بیگانہ را

"لست منی" گویدت مولائے ما
وائے ما۔ اے وائے ما۔ اے وائے ما

تم اس قدر سر سے پاؤں تک غیروں کے رنگ میں رنگے جا چکے ہیں اور غیر اسلامی تصورات و افکار و عقائد اس طرح عین اسلامی بن چکے ہیں، کہ آج حضور نبی اکرمؐ ادھر آنکلیں تو آپ کی نگہ حقیقت شناس، بلا تامل کہدے۔ کہ نہ یہ قوم، مسلمانوں کی قوم ہے اور نہ ہی ان کا دین، اسلام کا دین ہے۔

سوچو کہ اگر رسول اللہؐ یہ کہدیں کہ یہ لوگ ہم میں سے ہیں ہی نہیں، تو اس سے زیادہ تباہی اور کیا ہو سکتی ہے؟

زندگانی مثل انجم تا کجا ہستی خود در سحر گم تا کجا
دیدے از صبح دروغے خوردۂ رخت از پہنائے گردوں بردۂ

ذرا سوچو کہ یہ ستاروں کی مانند زندگی بھی کوئی زندگی ہے کہ ذرا سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور وہ گم ہو گئے۔ تم نے صبح کاذب سے ایسا فریب کھایا ہے کہ بساطِ فلک سے تمہارا بوریہ بستر بندھ چکا ہے۔

آفتاب استی یکے در خود نگر
از نجوم دیگراں تابے مخر

تم خود آفتاب عالمتاب ہو۔ تمہیں دوسروں کے ستاروں سے روشنی لینے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنی ہستی کو پہچانو۔

بر دلِ خود نقشِ غیر انداختی
خاک بردی۔ کیمیا در باختی

تم نے اپنے لوحِ دل پر دوسروں کے نقش مرتسم کر رکھے ہیں۔ تم نے اس قمارخانہ میں (اپنے ہاں کا) کیمیا دے کر مٹی لے لی ہے (اور اس پر خوش ہو کہ بازی تم نے ہی جیتی ہے!)

تاکجا رخشی ز تابِ دیگراں | سر سبک سازی ز شرابِ دیگراں
تاکجا طوفِ چراغِ محفلے | ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

تم دوسروں کی روشنی سے کب تک درخشندہ رہو گے۔ تم کب تک دوسروں کی محفل کی شمع کا طواف کرو گے۔ اپنی ذات کی نشوونما سے اپنے اندر اپنی روشنی پیدا کرو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کی شراب کا نشہ تمہاری عقل و خرد کو ماؤف کر چکا ہے اسے سر سے نکال دو۔

چوں نظر در پردہ ہائے خویش باش
می برد۔ اما بجائے خویش باش

نگاہ کی طرح اپنے پردوں کے اندر رہو۔ دنیا میں جہاں جی چاہے۔ جاؤ۔ چلو۔ پھرو لیکن اپنے مقام کو مت چھوڑو۔

درجہاں مثلِ حباب اے ہوشمند
راہ خلوت خانہ بر اغیار بند

حباب کی طرح زندگی بسر کرو کہ باہر کی ہوا تک بھی تمہاری داخلی دنیا میں بار نہ پا سکے۔

فرد، فرد آمد کہ خود را و اشناخت
قوم، قوم آمد کہ جز با خود نساخت

فرد وہی فرد ہے جو اپنی ہستی کو پہچانتا ہے۔ قوم، وہی قوم ہے جسے اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے جو کسی اور کی محتاج نہیں۔

از پیامِ مصطفےٰؐ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دون اللہ شو

لَا اِلٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تم دنیا میں کسی غیر خداوندی قوت کے سامنے نہ جھکو۔ اسی کا نام توحید ہے۔ یہی اس دین کا پیغام ہے جسے نبی اکرمؐ لے کر آئے تھے۔

سورۂ اخلاص کی تیسری آیت ہے۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ

اس کی تفسیر میں علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

قوم تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمتِ یک اسودش صد احمر است

ملتِ اسلامیہ، رنگ و نسل کے امتیاز سے بالاتر ہے۔ اس میں کالے گورے۔ سرخ و سفید کی کوئی تمیز نہیں۔ "قیمتِ یک اسود کش صد احمر است" کے معنی ہیں "اس کے ایک سیاہ فام انسان کی قیمت سو سرخ فام انسانوں جتنی ہے" اس سے علامہ اقبالؒ کی مراد یہ ہے کہ اسلام میں رنگ اور نسل کا کوئی امتیاز نہیں۔ لیکن یہاں انداز بیان میں تھوڑا سا سقم ہے۔ اسلام میں ایک سیاہ فام انسان ایک سرخ فام انسان کے برابر ہے۔ ایک سیاہ فام کی قیمت، سو سرخ فام کے برابر نہیں۔ اس میں ہر ابنِ آدم قیمت میں برابر ہے۔

قطرۂ آبِ وضوئے قنبرے

در بہا برتر زخونِ قیصرے

اس ملت میں، ایک غلام (قنبر) کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ قیمت میں قیصر کے خون سے زیادہ ہے۔ اس میں بھی شاعرانہ مبالغہ ہے۔ اسلام میں غلام اور شاہنشاہ کا خون قیمت میں برابر ہے۔ یہ نہیں کہ ایک کے پانی کا قطرہ دوسرے کے خون سے زیادہ گراں بہا ہے۔

فارغ از بابِ و امِ و اعمام باش

ہمچو سلمانؓ زادۂ اسلام باش

ملتِ اسلامیہ میں، اب وجد کی نسبتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ان سے آزاد ہو جانا چاہیئے۔ اس رمز کو حضرت سلمان فارسیؓ خوب سمجھتے تھے کہ جب ان سے ان کا شجرۂ نسب دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا "سلمان ابن اسلام"

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اب وجد کی نسبت کو تعارف کی غرض سے جائز قرار دیا ہے لیکن صرف تعارف کی غرض سے۔ اگر اس سے ملت میں افتراق پیدا ہوتا ہے یا حسب و نسب وجۂ افتخار بن جاتا ہے تو اس کی قطعاً اجازت نہیں۔

نکتۂ اے ہمدمِ فرزانہ بیں

شہد را در خانہ ہائے لانہ بیں

اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے شہد کے چھتے کو سامنے لاؤ۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

قطرۂ از لالۂ حمرا ستے

قطرۂ از نرگسِ شہلا ستے

ایں نمی گوید کہ من از عبہرم

آں نمی گوید من از نیلو فرم

اُس چھتے میں شہد کا ایک قطرہ گلِ لالہ کا ہوتا ہے اور ایک قطرہ گلِ نرگس کا۔ یہ قطرات سب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اس کے بعد کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں لالہ کا ہوں اور میں نرگس کا۔ وہ سب "شہد" کہلاتے ہیں۔

ملتِ ما شانِ ابراہیمی است

شہدِ ما ایمانِ ابراہیمی است

ملتِ اسلامیہ، مسلکِ براہیمیؑ کے شہد کے چھتے کی مانند ہے اور اس کا شہد ایمانِ ابراہیمی ہے۔ اس لئے اس میں اب وجد کی طرف نسبت کی بجائے دین کی طرف نسبت کرنی چاہیئے۔

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ
رخنہ در کارِ اخوت کردۂ

اگر تونے نسب کو ملت کا جزو بنادیا تو جس اخوت کی بنیادوں پر اسلام کی عمارت استوار ہوتی ہے، اس میں رخنہ پڑجائے گا۔

در زمینِ ما نگیرد ریشہ ات
ہست نامسلم ہنوز اندیشہ ات

ایسا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ تمہاری فکر، غیر اسلامی ہے اور تمہارے تصورات کا پودا ہماری زمین میں اجنبی۔ اس تصور کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

ابنِ مسعودؓ آں چراغ افسردِ عشق — جسم و جانِ او سراپا سوزِ عشق
سوخت از مرگِ برادر سینہ اش — آب گردید از گداز آئینہ اش
گریہ ہائے خویش را پایاں ندید — در غمش چوں مادراں شیون کشید

حضرت ابن مسعودؓ (مشہور صحابی) کے بھائی کا انتقال ہوگیا تو وہ اس کے غم میں بے حد مضطرب و بے قرار رہتے تھے۔ عام طور پر بھائی کی محبت کا یہی تقاضا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ان کے دردِ فراق کی وجہ بھائی کا رشتہ نہیں تھا، کچھ اور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ

اے دریغا آں سبق خوانِ نیاز — یارِ من اندر دبستانِ نیاز
آہ آں سروِ سہی بالائے من — در رہِ عشقِ نبیؐ ہمپائے من

حیف او محرومِ دربارِ نبیؐ
چشمِ من روشن ز دیدارِ نبیؐ

بھائی کے ساتھ ان کا رشتہ یہ تھا کہ وہ اسلام کے مکتب میں ان کے ہم سبق تھے اور عشقِ رسولؐ میں ان کے ہم سنگ۔ صدمہ انہیں اس کا تھا کہ وہ دربارِ رسالت مآب میں حاضری دیتے تھے اور ان کا بھائی اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہوگیا تھا۔ یعنی ان کا درد و غم، بھائی کی محبت نہیں تھی ایک مسلم رفیق کی جدائی تھی۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

ہماری پیوستگی زمین کے خاص خطوں سے نہیں۔ ہمارا باہمی رشتہ حسب اور نسب کا نہیں۔

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم

ہمارا باہمی رشتہ، نبی اکرمؐ کی امت ہونے کی جہت سے ہے۔ اسی رشتہ سے ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

رشتۂ ما یک تولّایش بس است — چشمِ ما را کیفِ صہبائش بس است
مستیٔ او تا بخونِ ما دوید — کہنہ را آتش زد و نو آفرید

ہماری قدرِ مشترک رسول اللہؐ سے ہمارا قلبی تعلق ہے۔ اسی شراب کے نشے سے ہم سب مست ہیں۔ اس شرابِ محبت کی خصوصیت یہ ہے کہ جب یہ خون میں حلول کرتی ہے تو ہر غیر خداوندی تصور کو جلا کر خاک کر دیتی ہے اور اس کے بعد ایک جدید انسان کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ وہ کچھ اور سے اور بن جاتا ہے۔

عشقِ او سرمایۂ جمعیت است — ہمچو خون اندر عروقِ ملت است

حضورؐ کا عشق، ملت کی جمعیت کا سرمایہ ہے۔ یہ ہماری رگوں میں خونِ زندگی بن کر دوڑتا ہے۔

عشق در جان و نسب در پیکر است — رشتۂ عشق از نسب محکم تر است

نسب کا تعلق انسان کے جسم سے ہوتا ہے اور ایمان کا تعلق اس کی جان سے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا رشتہ نسب کے رشتہ سے کہیں زیادہ مضبوط ہے

عشق ورزی از نسب باید گذشت — ہم ز ایران و عرب باید گذشت

اگر تو ایمان چاہتا ہے تو نسب کی بنا پر ایک ملت بننے کے تصور کو چھوڑ دے۔ اور اس طرح ایرانی اور عربی امتیازات کو ختم کر دے۔

امتِ او مثلِ او نورِ حق است
ہستیٔ ما از وجودش مشتق است

جس طرح نبی اکرمؐ خدا کی طرف سے روشنی (سراجاً منیراً) بن کر آئے تھے اور شرق و غرب کی نسبتوں سے بلند تھے اسی حضورؐ کی امت بھی زمان و مکان اور حسب و نسب کے امتیازات سے بلند ہے۔ تمام دنیا میں بسنے والے مومن ایک امت کے افراد اور ایک عالمگیر برادری کے رکن ہیں۔

نورِ حق را کس نجوید زاد و بوم
خلعتِ حق را چہ حاجت تار و پود (مولانا روم)

نورِ حق کے متعلق یہ نہیں پوچھا جاتا کہ اس کی جائے پیدائش اور وطن کونسا ہے جس طرح حق کی پوشاک کا تانا بانا کچھ نہیں ہوتا اسی طرح حق کی روشنی کی زاد و بوم کوئی نہیں ہوتی۔

ہر کہ در پابندِ اقلیم و جد است
بے خبر از لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ است

جو شخص وطن اور نسل کے امتیازات میں گھرا ہوا ہے وہ خدا کی صفتِ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کی حقیقت سے بے خبر ہے۔

قرآن کی ابتدار

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

سے ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اس لئے حمد و ستائش کا سزاوار ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔ اور

اس کی انتہا

رَبِّ النَّاسِ ۔ مَلِكِ النَّاسِ ۔ اِلٰهِ النَّاسِ

پر ہوتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قوت و اقتدار بھی اسی خدا کے شایانِ شان ہے جو نوعِ انسان کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے

رعایتی قیمت ۵/- روپے

نظامِ ربوبیت

رعایتی قیمت 5/- روپے

لہٰذا جو معاشرہ

اپنی نسبت خدا کی طرف کرتا ہے وہ اسی صورت میں درخورِ حمد و ستائش، اور سزاوارِ قوت و اقتدار ہو سکتا ہے کہ وہ نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کا کفیل ہو۔

یہ ہے اسلام کی ساری تعلیم کا خلاصہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اسلامی نظام کے بنیادی تصورات

(محترم پرویز صاحب کی تقریر جو ریڈیو پاکستان کراچی سے ۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو نشر ہوئی)

اسلامی نظام کے بنیادی تصورات کے لئے ہمارے ہاں اسلامی آئیڈیالوجی کی اصطلاح اس قدر عام ہو چکی ہے کہ یہ گویا ہماری زبان کا جزو بن گئی ہے۔ اس لئے میں ان بنیادی تصورات کے لئے اسلامی آئیڈیالوجی کی اصطلاح ہی استعمال کروں گا۔ یہ اصطلاح ہمارے سامنے سب سے پہلے اس وقت آئی جب قائد اعظم علیہ الرحمۃ نے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مطالبہ کی بنیاد اس نظریہ اور عقیدہ پر تھی کہ قومیت کی تشکیل آئیڈیالوجی کی وحدت سے ہوتی ہے۔ نہ کہ وطن کے اشتراک اور جغرافیائی حد بندیوں سے۔ پاکستان کے مخالفوں نے سرے سے اس اصول کو ماننے ہی سے انکار کر دیا کہ قومیت سے آئیڈیالوجی کا کوئی تعلق بھی ہے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ساری جنگ اسی بات پر ہوتی رہی کہ قومیت کا تعلق وطن سے ہے یا آئیڈیالوجی سے۔ اور اسی لئے اسلامی آئیڈیالوجی کی تشریح کا موقعہ ہی نہ آیا۔

قائد اعظمؒ کے یقین اور مسلمان قوم کے اتحاد سے پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھر آیا۔ اس جنگ میں آئیڈیالوجی کے نظریہ کو فتح ہوئی یہ بات اس نظریہ کی فطری قوت کا اظہار تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اس سوال کا جواب ہمارے قومی وجود کے لئے ضروری تھا کہ اسلامی آئیڈیالوجی ہے کیا جس کے لئے ہم نے ایک خطۂ زمین حاصل کیا ہے۔؟

یہ کام مجلس آئین ساز کے سپرد کیا گیا کہ وہ اسلامی آئیڈیالوجی کی تشریح کرے اور اسی بنیاد پر آئین کی عمارت کھڑی کرے کوئی عمارت بنیاد کے بغیر ریت کی دیوار سے زیادہ مضبوط نہیں ہو سکتی۔ ہماری مجلس آئین ساز نو برس تک کھجوروں کی آنکھ مچولی کھیلتی رہی اور جب ملک کا آئین بن گیا تو اس میں کہیں بھی اس اسلامی آئیڈیالوجی کی وضاحت نہ تھی جو پاکستان کی بنیاد ہے۔ یہ آئین اسلامی تھا یا نہیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس آئین کی کوئی بنیاد نہ تھی اور بنیاد کے بغیر نہ تو عمارت بلند ہو سکتی ہے نہ قائم

رہ سکتی ہے۔ نہ ہی اُس آئین کی ناکامی کے اسباب کی تلاش میں بہت دور تک جانے کی ضرورت ہے۔ بنیادی بات تو یہی ہے کہ آئین بے بنیاد تھا اور اس مملکت کی ترقی میں مدد نہیں دے سکتا تھا۔ جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔

فطرت افراد کی غلطیوں اور گناہوں سے تو کسی حد تک چشم پوشی کر لیتی ہے لیکن قوموں کے جرائم کا بہت سخت محاسبہ کرتی ہے یہ فطرت کا قانون ہے۔ معلوم نہیں کہ چشم فطرت کو پاکستان کی کون سی بات پسند آگئی کہ اس نے مادرِ مہربان کی طرح اپنے سخت قانون میں نرمی پیدا کر دی اور ہمیں ایک بار پھر اپنے آپ کو بنانے اور اپنی تعمیر کرنے کا موقع عطا کر دیا۔ یہ فطرت کا بڑا احسان ہے کہ وہ بے بنیاد آئین ختم ہو گیا اور ہم پھر وہیں پہونچ گئے جہاں ۱۹۴۷ء میں تھے۔ زمانہ کی ایسی سعید اور خوش بختانہ گردش شاید ہی کسی اور قوم کو ملی ہو۔ اس طرح ہمیں اپنے سفر کو دوبارہ سیدھے راستے پر اپنی منزل کی طرف جاری رکھنے کا موقع مل گیا اور آج پھر ہمارے سامنے وہی سوال ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی ہے کیا؟

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

اسلامی آئیڈیالوجی کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا اور جاننا بہت ضروری ہے کہ قرآن کریم خود انسانی زندگی کے متعلق کیا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کا ایک تصور تو یہ ہے کہ انسان عبارت ہے صرف اپنے طبعی جسم سے۔ اس کا جسم طبعی قوانین کے تحت زندہ رہتا ہے اور انھیں قوانین کے تحت مر جاتا ہے اور جسم کی موت کے ساتھ انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصد جسم کی پرورش اور اپنی نسل بڑھانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن اس تصور کو زندگی کو حیوانی سطح اور کفر کا مسلک قرار دیتا ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) اس کے برعکس قرآن کا دیا ہوا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے عام طور پر انسانی ذات یا انا سے تعبیر کیا جاتا ہے قرآن حکیم اسے روحِ خداوندی کا نام دیتا ہے۔ (واضح رہے کہ "روحِ خداوندی" ذاتِ خداوندی کا حصہ نہیں ہوتی۔ اس سے مراد الوہیاتی توانائی ہے) انسانی جسم میں ہر آن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن انسانی ذات اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اس ذات کی مناسب نشوونما کی جائے تو جسم کی موت سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ زندگی کی بلند تر اور ارتقائی منزلوں کو طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد اپنی ذات کی نشوونما ہے اور ذات کی نشوونما جسم کی پرورش کے بغیر نہیں ہو سکتی کیونکہ ذات اگر موتی ہے تو جسم اس کی سیپی۔ اسی لئے قرآنی تصور کے مطابق انسانی جسم اور ذات دونوں کی نشوونما ضروری اور ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔

انسانی جسم کی نشوونما کے تقاضے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کی رو سے ہوتی ہے جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ یہ مستقل اقدار جو وحی کے ذریعہ ملتی ہیں اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انھیں اقدار کا نام اسلامی آئیڈیالوجی ہے۔

آئیڈیالوجی ایک تصوراتی چیز ہے اور اسے محسوس شکل اختیار کرنے کے لئے معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی

نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک ہی میں ایک معاشرہ اور ریاست کی شکل اختیار کرلی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی تصورِ حیات کے مطابق مملکت مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے افراد مملکت کی ذات کی نشوونما۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی جسمانی پرورش اور ان کی ذات کی تربیت اور نشوونما کے لئے تمام ذرائع فراہم کرے اور اس میں افراد کے درمیان کوئی فرق نہ پیدا کیا جائے۔ ہر فرد کو یکساں مواقع حاصل ہوں۔

قرآن کی رو سے سب سے پہلی مستقل قدر یہ ہے کہ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ" ہم نے آدم کے تمام بیٹوں کو انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی یہ عزت و تکریم اس کی ذات کی بنا پر ہے۔ اگر یہ عزت جسم کے اعتبار سے ہوتی تو اس میں حیوانات بھی شامل ہوتے۔ لہٰذا ہر فرد کی عزتِ نفس کا تحفظ اسلامی مملکت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس جہاں رنگ اور نسل کی کوئی تفریق نہیں وہاں مذہب و ملت کی بھی کوئی تمیز نہیں ہے۔ عدل درحقیقت اسی بنیادی تقاضے کو پورا کرنے کا نام ہے۔ اور اس باب میں قرآن یہاں تک تاکید کرتا ہے کہ "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو"۔

ظاہر ہے کہ جب ہر فرد یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے تو کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں ہوسکتا۔ یہ قرآن کی رو سے دوسری مستقل قدر ہے۔ اسلامی نظام میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے۔ یہ قوانین اس نظام کی سب سے بڑی شخصیت پر بھی اسی طرح نافذ ہوتے ہیں جس طرح کسی معمولی کارکن پر۔ اس میں اور تو اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کہ جن سے بلند تر شخصیت کا تصور بھی انسان کا ذہن نہیں کرسکتا اس کا اعلان کرتی ہے کہ "انا اول المسلمین" میں اس قانون کے سامنے سر جھکانے والوں میں سے سب سے پہلا ہوں۔ اسلامی نظام کی یہ بنیادی قدر کسی انسان کو دوسرے انسان کے ذاتی مقصد کے حصول کا آلۂ کار نہیں بننے دیتی۔ ایک انسان کو جو چیز دوسرے انسان کے ذاتی مقصد کے حصول کا آلۂ کار بناتی ہے وہ ضرورت اور احتیاج ہے۔ ایک مزدور ہماری گالیاں کھانے کے باوجود ہمارا کام کیوں کرتا ہے؟ محض اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے بغیر اسے رات کو روٹی نہیں مل سکتی۔ اسلامی نظام، معاشرہ کے تمام افراد کو اس احتیاج اور ضرورت سے بے نیاز کردیتا ہے تاکہ ان کی ذات کی عزت اور تکریم میں کوئی فرق پیدا نہ ہو۔ اس جگہ اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر فرد اپنی ضرورت سے بے نیاز ہوجائے تو معاشرہ کا کام کیسے چلے گا تو قرآن کے مطابق یہ تمام افراد اپنے سامنے ایک ہی مقصد رکھتے ہیں جو ان کے درمیان مشترک ہوتا ہے اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ اس قسم کا تعاون بھی قرآن حکیم کی رو سے اسلامی نظام کی ایک مستقل قدر ہے اور یہ تعاون اسلامی نظام کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

لیکن ان افراد کا یہ باہمی تعاون بھی کسی دوسرے خطۂ زمین میں بسنے والے انسانوں کو اپنا آلۂ کار بنانے یا ان پر ظلم کرنے کے لئے نہیں ہوسکتا جیسا کہ آج اقوامِ عالم کے درمیان ہو رہا ہے۔ اسلامی معاشرے میں بسنے والے انسانوں کی زندگی کا نصب العین تمام نوعِ انسانی کی بہبود اور منفعت رہا ہے اور آئندہ بھی یہی ہوگا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے یہ کہہ کر ایک مستقل قدر بنا دیا ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

بقائے دوام صرف اس نظریہ یا عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری قرار دیتا ہے جب یہ ارشاد ہوتا ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳)، تمام انسان ایک برادری کے افراد ہیں اور ایک ہی درخت کی شاخیں۔ ان میں فرق ہے تو بس اتنا کہ جو لوگ اسلامی آئیڈیالوجی کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیتے ہیں وہ ایک جماعت کے اراکین بن جاتے ہیں اور جو اس آئیڈیالوجی سے انکار کرتے ہیں اور انسانوں کو گروہوں، پارٹیوں، فرقوں اور قوموں میں تقسیم کر کے درندوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹتے رہتے ہیں وہ دوسری جماعت کے افراد بن جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب قرآن عالمِ انسانیت میں اس قسم کی فرقہ بندی اور پارٹی بازی کو شرفِ انسانیت کے منافی قرار دیتا ہے تو وہ خود جماعتِ مومنین کے اندر مختلف فرقوں اور پارٹیوں کے وجود کو کس طرح جائز قرار دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے فرقہ بندی کو عملی شرک بتایا ہے۔ ایک نصب العین رکھنے والے افراد ہمیشہ ایک جماعت کے فرد ہوتے ہیں۔ مختلف گروہ اس وقت بنتے ہیں جب نصب العین مختلف ہو جائیں۔ اسلام میں نصب العین کا اختلاف شرک کہلاتا ہے اس لئے کہ اسلامی نصب العین جسے اسلامی آئیڈیالوجی کہا گیا ہے، خدا کی طرف سے متعین کردہ ہے اور خدا کی توحید کا عملی مفہوم یہ ہے کہ تمام توحید پرستوں کا نصب العین بھی ایک ہو جائے۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اسے مختصر الفاظ میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اسلامی آئیڈیالوجی ان مستقل اقدار یا کبھی نہ بدلنے والے اصولوں کے مجموعے کا نام ہے جو اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہیں اور ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔

(۲) جب کوئی مملکت ان اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے لیتی ہے تو اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں۔

(۳) جو دستاویز اسلامی مملکت کے اس نصب العین کا اعلان کرے اور مملکت کی عمارت کو ان اقدار کی نیو دوں پر استوار کرنے کا نقشہ مرتب کرے اسے اسلامی آئین کہیں گے۔ اس آئین کی رُو سے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ مملکت کے بسنے والے تمام انسانوں کی عزتِ نفس کی حفاظت کا انتظام کرے اور ہر شہری کے لئے وہ تمام اسباب و ذرائع فراہم کرے جن سے اس کے جسم کی پرورش اور ذات کی نشوونما ہو جائے تاکہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم اور محتاج نہ ہو اور انسان حیوانی سطح پر زندگی بسر نہ کرے۔

تاریخ عالم نے خوش بختی سے ایک ایسی مملکت کے نظارے سے اپنی نگاہیں روشن کی ہیں جہاں ہر فرد مقامِ آدم اور مقامِ مومن کی بلندیوں تک پہنچ گیا تھا۔ یہ مملکت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں قائم فرمائی تھی اور خلفائے راشدینؓ کے عہدِ مبارک میں اس کی حدود نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنی آغوش میں پناہ دی تھی۔ انسانیت کی نجات اسی نظام کے قیام میں ہے۔

حقائق و عبر

تفسیرِ قرآن کے اختلافات

ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۵۹ء کے باب "رسائل و مسائل" میں حسب ذیل سوال اور (مدیر رسالہ) سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے قلم سے) اس کا جواب شائع ہوا ہے۔

سوال:۔ قرآن پاک کی مختلف تفسیریں کیوں ہیں؟ آنحضورؐ نے جو تفسیر بیان کی ہے وہی ہو بہو کیوں نہ لکھ لی گئی؟ کیا ضرورت ہے کہ لوگ اپنے اپنے علم کے اعتبار سے مختلف تفسیریں بیان کریں اور باہمی اختلافات کا ہنگامہ برپا رہے۔

جواب۔ قرآن پاک کا جو فہم دین کے حقائق اور اس کے احکام جاننے کیلئے ضروری تھا اس کی حد تک تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارشادات اور اپنے عمل سے اس کی تفسیر فرما گئے ہیں لیکن ایک حصہ لوگوں کے غور و خوض اور فکر و فہم کے لئے بھی چھوڑا گیا ہے تاکہ وہ خود بھی تدبر کریں اس حصے میں اختلافات کا واقع ہونا ایک فطری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا اگر یہ ہوتا کہ دنیا میں سرے سے کوئی اختلاف ہو ہی نہیں تو وہ تمام انسانوں کو خود ہی یکساں فہم عطا فرماتا۔ بلکہ عقل و فہم اور اختیار کی قوتیں عطا کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی اور اس صورت میں آدمی کے لئے نہ کوشش کا کوئی میدان ہوتا نہ ترقی و تنزل کا کوئی امکان"۔

جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں قرآن کریم میں یا تو دین کے حقائق ہیں یا دین کے احکام۔ باقی جو کچھ ہے (مثلاً تشبیہات، امثال، قوانینِ فطرت سے دلائل، اقوام گذشتہ کے احوال و کوائف وغیرہ) وہ انہی دونوں (دین کے حقائق یا احکام) کے سمجھانے کے لئے ہے۔ سوال یہ ہے کہ دین کے حقائق اور احکام جاننے کے لئے جو کچھ ضروری تھا، اگر اس کی تفسیر رسول اللہ نے فرما دی تو پھر قرآنِ کریم میں باقی کیا رہا جسے لوگوں کے غور و خوض اور فکر و فہم کے لئے چھوڑا گیا تاکہ وہ خود بھی تدبر کریں۔ ہم محترم مدیر ترجمان القرآن سے گذارش کریں گے کہ وہ براہِ کرم اسکی وضاحت فرمائیں۔ کیونکہ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

(۲) مدیر ترجمان القرآن نے جو کچھ کہا ہے اس سے اصل سوال کا جواب بھی نہیں ملتا۔ مستفسر نے پوچھا یہ تھا کہ رسول اللہ نے قرآن کی جس قدر تفسیر بھی فرما دی تھی "وہ ہو بہو کیوں نہ لکھ لی گئی"۔ تاکہ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ رہتا؟

ہم محترم مستفسر سے عرض کریں گے کہ ان کے اس سوال کا اطمینان بخش جواب ایک مدیر ترجمان القرآن تو کیا، تمام مذہب پرست طبقہ مل کر بھی نہیں دے سکتا۔ اعتبار نہ ہو تو انہیں مجبور کیجئے کہ وہ اس کا جواب دیں اور پھر دیکھئے کہ جواب کیا ملتا ہے؟ پانچ سات برس ادھر

کا ذکر ہے کہ یہی سوال طلوع اسلام نے بھی کیا تھا۔ یعنی یہ سوال کہ اگر احادیث نبوی دین کا لازمی جزو تھیں۔ اور ان میں بیان کردہ احکام کو قرآن کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا تو نبی اکرمؐ نے انھیں اپنے الفاظ میں خود قلمبند کیوں نہ کرا دیا؟ اس کا جواب ان حضرات کی طرف سے یہ دیا گیا کہ اُس زمانے میں سامانِ کتابت کی کمی تھی اس لئے انھیں لکھوایا نہیں گیا تھا۔

کیا ترجمان القرآن کے مستفسر صاحب کا اس جواب سے اطمینان ہو جاتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا براہِ کرم وہ ان حضرات پر زور دیں گے کہ وہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب دیں۔ اس لئے کہ اس سوال کا دین سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہم مستفسر موصوف کی اطلاع کے لئے اتنا اور عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ جب مودودی صاحب سے یہ دریافت کیا گیا کہ اگر قرآن کریم میں بیان کردہ اصولی احکام کی تفاصیل بھی دین کا جزو تھیں اور انھیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا تو انھیں خود قرآن کریم میں ہی کیوں نہ بیان کر دیا گیا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ اس سے قرآنِ کریم کی ضخامت بڑھ جاتی اس لئے انھیں رسول اللہ پر الگ وحی کر دیا گیا۔ اور جب پوچھا گیا کہ رسول اللہ نے اپنی اس وحی کو قلمبند کیوں نہ کرا دیا تا کہ وہ بھی قرآن کی طرح حرفاً حرفاً محفوظ رہتی، تو اس کا جواب ترجمان القرآن میں یہ دیا گیا تھا کہ اُس زمانے میں سامانِ کتابت کی کمی تھی۔

"ببلو" میموریئل

ہمارا ببلو ایک حسین خواب تھا جس کی تعبیر حیرت نکلی۔ وہ ہم سب کو حیران چھوڑ کر چلا گیا۔
یہ ببلو کی دوسری سالگرہ کا مہینہ ہے۔ اسے ہم یوں منانا چاہتے ہیں کہ اس کی یاد میں غیر مستطیع طالبعلموں میں قرآنی لٹریچر تقسیم کیا جائے۔
ادارۂ طلوعِ اسلام براہِ کرم اس کا انتظام کر دے۔ شکریہ

شمیم

ایک حسین بچے کی یہ یادگار بھی کیسی حسین ہے! ادارہ اس فنڈ سے مستحق طالب علموں کو بلا قیمت یا بارعایت قرآنی لٹریچر دیا کرے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

کئی سو

پیشگی خریداران

کو

ہر وہ کتاب جسے وہ پسند کرتے ہیں

گھر بیٹھے

بلا محصول ڈاک مل جاتی ہے

رجسٹری کی فیس ڈیوڑھی ہو جانے سے یہ محصول ڈاک

اب اور بھی زیادہ ہو گیا ہے

ایکسو روپے یکمشت جمع کرا کر

آپ بھی اس رعایت سے

فائدہ اٹھائیے۔

رابطۂ باہمی

رپورٹیں

گوجرانوالہ

اس ماہ بزم کے دو اجلاس ہوئے۔ اراکین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کے باعث ہفتہ وار اجلاس کے لئے نئی جگہ کا انتظام کرنا پڑا۔ دار المطالعہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ جس میں احباب کی باہمی رفاقت سے ادارہ طلوع اسلام کا تمام لٹریچر جمع کر لیا گیا ہے۔ جو حضرات اس دار المطالعہ سے مستفید ہوئے ہیں ان کے تاثرات یہ ہیں کہ اس مطالعہ کے بعد ہمیں اسلام کی گم گشتہ منزل پھر نظر آ رہی ہے۔ بزم کے احباب پر واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ خدمت خلق اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کو زیادہ سے زیادہ وسعت دیں۔ بالخصوص طلوع اسلام کا پیغام کالجوں کے زیر تربیت شاہین بچوں تک پہنچائیں۔

حالیہ اجلاس میں شیخ محمد اقبال صاحب نے اسلامک آئیڈیالوجی، اور طلوع اسلام کے مسلک و مقصد پر بڑی پر مغز اور موثر تقریر کی اور سوالات کے جواب دیئے۔ محترم عبد الرزاق و چوہدری عمر حیات صاحب نے بھی اپنے خطابات میں نشر و تبلیغ کی اہمیت پر زور دیا۔ بزم میں تین نئے احباب نے شرکت کی اور طلوع اسلام کے دو نئے خریدار بنائے گئے۔

رسول نگر (ضلع گوجرانوالہ)

۲ر ستمبر بعد جمعۃ المبارک یہاں بزم کا قیام کے سلسلہ میں معززین قصبہ کا پہلا اجتماع ہوا۔ قیام بزم کے بعد خان بہادر قاضی حفیظ الدین نمائندہ بزم منتخب کئے گئے۔ یہاں کے ممتاز احباب نے بزم کی شرکت قبول کی ہے (ادارہ طلوع اسلام بزم کے قیام کی توثیق کرتا ہے)

جلالپور جٹاں (ضلع گجرات)

بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ طلوع اسلام کے نئے خریدار بنائے جا رہے ہیں۔

پنج کسی (ضلع ملتان)
کنونشن کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کی کوششیں جاری ہیں۔ نظامِ ربوبیت کی نشر و اشاعت سے رابطہ عوام کا سلسلہ قائم کیا جا رہا ہے۔ "تقدیرِ اُمم" کا مقالہ پڑھ کر سنایا گیا۔

چک ۱۹۸ (ضلع جھنگ)
ماہِ اگست سے بزم صحیح معنوں میں سرگرم کار ہو گئی ہے۔ ۱۴ اگست کو یومِ استقلال کی اہمیت پر مسجد میں تقریر کی گئی۔ قرآنی معاشرہ کے خط و خال بھی واضح کئے گئے۔ حاضرین نے متاثر ہو کر پوری ہم آہنگی کا اظہار کیا۔ اگلے اجلاس میں یہاں کے معزز اور تعلیم یافتہ طبقہ کو دعوت دی گئی۔ لٹریچر کے مطالعہ کے بعد کئی احباب شریکِ بزم ہو گئے۔ سید الطاف حسین گیلانی بزم کے نمائندہ اور مہر محمد علی سکریٹری منتخب کئے گئے۔

ہنگو (ضلع کوہاٹ)
بزم کے ہفتہ وار اجتماعات میں تعلیم یافتہ طبقہ ذوق و شوق سے شریک ہو رہا ہے۔ نشر و تبلیغ کے سلسلہ میں اب احباب نے مضافات کے دیہات کا رخ کیا ہے اور نتائج خوش آئند ہیں۔

شیخوپورہ
ابھی ابھی میونسپل ہال کے ایک اجتماع میں ادارے کا لٹریچر کافی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ دو ممتاز وکلاء نے طلوعِ اسلام کی خریداری قبول کی۔

مری
بزم کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں اور قرآنی فکر کے لئے فضا سازگار ہو رہی ہے۔ مری کے مڈل اور ہائی اسکولوں میں طلوع کا لٹریچر پھیلا دیا گیا ہے۔ اور اس سے خوشگوار نتائج ابھر رہے ہیں۔ یہاں آنے والے سیاحوں میں بھی احباب نے پمفلٹس کی تقسیم کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

چونڈہ (ضلع سیالکوٹ)
عید میلاد النبی صلعم پر "مقامِ محمدی" اور "اسلامک آئیڈیالوجی" کے پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ پرویز صاحب کا پیغام اب لوگوں کی سمجھ میں آ رہا ہے اور ان کے دلوں کی کیفیت بدل رہی ہے۔

سید حسین (ضلع جہلم)
بزم باقاعدگی سے اپنے اجلاس کر رہی ہے۔ کتب برائے مطالعہ دی گئی ہیں اور پمفلٹس کی تقسیم وسیع پیمانے پر کی جا رہی ہے۔

چنیوٹ (ضلع جھنگ)
بزم ادارہ طلوعِ اسلام کے لٹریچر کی تقسیم سرگرمی سے کر رہی ہے۔ طلوعِ اسلام کے خریداروں کی تعداد میں آٹھ کا اضافہ ہوا ہے۔ دار المطالعہ میں آٹھ نئی کتابیں شامل کی گئی ہیں۔ سرگودھا میں بھی بعض احباب کی معرفت لٹریچر فراہم کیا جا رہا ہے۔

پنڈ دادن خاں (ضلع جہلم)
اراکین بزم کا اجتماع ہر جمعہ کو باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ "رحمۃ للعالمین" اور "اسلامک آئیڈیالوجی" کے اردو اور انگریزی پمفلٹ کافی تعداد میں تقسیم کئے جا چکے ہیں۔ ادارہ کی کتب بھی فہمیدہ حضرات کو برائے مطالعہ دی گئی ہیں۔

مردان
درسِ قرآن کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ٹیپ ریکارڈر خرید لیا گیا ہے اور اسکے ذریعہ اب محترم پرویز صاحب کا پیغام ان کی اپنی آواز میں مردان کی فضا میں گونج اٹھے گا۔

پشاور بزم کے حالیہ اجلاس میں رفیقِ عزیز بستانی مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کی گئی اور پسماندگان مرحوم و محترم پرویز صاحب سے اظہارِ تعزیت کیا گیا۔ صدر کنونشن کمیٹی چوہدری عبدالرحمٰن صاحب کے والد مرحوم کے حق میں بھی دعائے مغفرت اور چوہدری صاحب موصوف اور ان کے اعزا سے تعزیت کی گئی۔

محترم پرویز صاحب کا دورہ اور پروگرام

۱۴ر اکتوبر (بدھ) قبل از دوپہر راولپنڈی پہنچیں گے۔ بعد دوپہر روانگی برائے کیمبلپور۔
بعد نمازِ مغرب کیمبلپور میں خطاب

۱۵ر اکتوبر (جمعرات) صبح۔ پشاور
پشاور میں خطاب بعد نمازِ مغرب

۱۶ر اکتوبر (جمعہ) " " " "

۱۷ر اکتوبر (سنیچر) صبح۔ مراجعت لاہور

تمام بزمیں توجہ کریں

"قرآن کا معاشی نظام" پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ عنوان ہے

پاکستان میں
کوئی بھوکا نہ رہے

اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ جلد فرمائشیں بھیجئے۔ قیمت فی پمفلٹ ۲ر

(۲) یہ پمفلٹ انگریزی میں بھی عنقریب شائع ہوگا۔ اس کی فرمائشیں بھی بھیجدیجئے۔ اسکی قیمت فی پمفلٹ ۴ر ہوگی۔

ہفت روزہ طلوعِ اسلام

جلد ۸ کے شمارہ نمبر ۱۹۔۲۰۔۲۱۔۲۲۔۲۴۔۲۵۔۲۹۔۳۰۔۳۱۔۳۳۔۳۸۔ بزم ہائے طلوعِ اسلام چھ پیسے کے ٹکٹ ڈاک ارسال کرکے مندرجہ ذیل پتہ سے مفت حاصل کر سکتی ہیں۔

خواجہ محمد حسین نمائندہ بزم طلوعِ اسلام۔ حاجی پورہ۔ گوجرانوالہ